ابن صفی کا نیا رخ
مشتاق احمد قریشی

اب ایسا اور ڈھونڈ کے لائیں کہاں سے ہم

ابن صفی شاعر مصنف اور مصور

ابن صفی کا نیا رخ

ابن صفی کا ایسا رخ جس سے ان کے قارئین نا آشنا ہیں

مولف و مرتب

مشتاق احمد قریشی

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔

فون: 37232336'37352332 فیکس: 37223584

www.ilmoirfanpublishers.com

E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

موضوع کتاب	ابن صفی کی مصوری
مولف مرتب	مشتاق احمد قریشی
تزئین وآرائش	نورالدین شہروز
منتظم اشاعت	محمد علی قریشی
سن اشاعت	مئی 2017ء
قیمت	300 روپے + ابن صفی کیلئے دعائے مغفرت

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔

فون: 37352332'37232336 فیکس: 37223584

www.ilmoirfanpublishers.com

E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

ناشر: نئے افق پبلی کیشن 7 فرید چیمبر عبداللہ ہارن روڈ صدر، کراچی

مکتبہ القریش لاہور

انتساب

محترم ابن صفی کے ہر اس قاری کے نام
جو ان کے لیے مغفرت اور بلندی درجات کی دعا کرے

فہرست

گفتگو

کہنے کو تو بہت کچھ ہے لیکن ان سطور کو لکھتے ہوئے محترم ابن صفی صاحب کی نصیحت مجھے یاد آ گئی ہے ان کا قول تھا کہ دنیا تو کہنے کے لیے ہے آپ کو اگر کوئی برا یا بھلا کہتا ہے تو وہ اپنے کسی تعلق کا اظہار کر رہا ہوتا ہے۔ اچھے یا برے اگر اپنوں کا اچھا کہا ہمیں مسرت دیتا ہے تو پھر اپنوں کے کہے کا برا کہیں ماننا چاہیے بلکہ ایسے سوچنا سمجھنا چاہیے کہ انہوں نے کیوں برا کہا کڑوے گھونٹ پی لینا ہی بہادری ہے بلکہ انسانیت ہے نبی کریم ﷺ کی حدیث ہے جو تمہیں چھوڑ دے (یا توڑے) تم اسے گلے لگا لو۔

محترم ابن صفی کے تعلق کے حوالے سے میری یہ چوتھی تالیف ہے اس سے قبل دو بڑے، یادش بخیر اور ابن صفی کون آپ ملاحظہ کر چکے ہیں یہ کتاب "ابن صفی کا نیا رخ" ہے جو بس اچانک ہی مرتب ہو گئی ہے گزشتہ دنوں میں اپنے کچھ کاغذات تلاش کر رہا تھا اگر یوں کہا جائے کہ میں اپنی درازوں کی صفائی کر رہا تھا تو بھی غلط نہ ہوگا جانے کب کے محفوظ کیے ہوئے محترم ابن صفی صاحب کے مسودات سامنے آ گئے حالانکہ میں نے اپنے خیال کے مطابق سارے ہی مسودات راشد اشرف کی معرفت ابن صفی صاحب کے صاحبزادے جناب احمد صفی کو بھیج دیے تھے میں سب کام چھوڑ کر ان صفحات کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا تو اچانک ہی ان مسودات میں سے ابن صفی صاحب کے قلم پارے سامنے آ گئے انہیں دیکھتے ہی یہ خیال آیا جو رخ ان کے قارئین سے اوجھل ہے کیوں نا اسے کتابی صورت محفوظ کر کے محترم ابن صفی کے قارئین کی نذر کر دیا جائے ویسے تو ابن صفی صاحب کے تمام ہی مسودات پر جگہ جگہ اسکیچز ملتے ہیں وہ جب کسی ناول کو لکھتے ہوئے کہیں رک جاتے یا سوچنے میں مصروف ہوتے تو بھی ان کا قلم کاغذ پر چلتا رہتا اور یوں مسودے کے کسی کنارے پر کوئی چہرہ نمایاں ہو جاتا ایسے بہت سے اسکیچز ان کے مسودات پر موجود ہیں گو کہ میرے پاس چند ہی مسودات ہیں لیکن ان میں سے برآمد ہونے والے خاکوں کی نوعیت جدا ہے یہ پورے پورے صفحے پر مسودات سے ہٹ کر بنائے گئے ہیں یہ تمام خاکے ان کے نوک قلم سے نقش ہوئے ہیں اس لیے ان کی اہمیت کم از کم میرے نزدیک بہت زیادہ ہے ابن صفی صاحب کی مصوری کا یہ رخ اپنی جدا شناخت رکھتا ہے۔ وہ ایک حقیقی شاعر اور مصنف ہی نہیں تھے وہ ایک مصور بھی تھے ان کے اسی رخ کو پیش کرنے کے لیے پہلے میرا خیال تھا اور جیسا کہ میں نے جناب احمد صفی اور راشد اشرف سے مشورہ بھی کیا تھا کہ صرف ان خاکوں کو ہی کتابی شکل دے دی جائے لیکن خیال آیا کہ ابن صفی صاحب کے قارئین ان کی تحریروں کے دلدادہ ہیں ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ جاننے کے بارے میں تجسس کا شکار رہتے ہیں اس لیے میں نے سوچا کہ کیوں نا ایسے مضامین جو اس سے پہلے ابن صفی صاحب کے متعلق کتابی صورت میں شائع نہیں ہو سکے انہیں یکجا کر دیا جائے یوں یہ ایک کتاب مرتب ہو گئی۔

اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں مجھے اردو بک ریویو دہلی کے مدیر جناب عارف اقبال کا شکریہ ادا کرنا ہے مجھے ان کا تعاون بھی حاصل ہوا۔ انہوں نے اپنے وہ تمام مضامین جن کا انہوں نے ابن صفی ادبی مشن کے دوسرے ایڈیشن میں اضافہ کیا ہے مجھے ارسال کر دیے ان میں کچھ مضامین روک کر باقی شامل اشاعت کر لیے گئے ہیں یوں یہ کتاب ابن صفی کا نیا رخ مرتب ہو گئی۔ اس کتاب میں نیا رخ میں شائع شدہ چند مضامین کے علاوہ جناب عارف اقبال صاحب کے ارسال کردہ مضامین اور محترم ابن صفی صاحب کے وہ نقش و نگار جو ان کے لافانی قلم کے شاہکار ہیں پیش کر رہا ہوں اس امید کے ساتھ کہ آپ کو پسند آئیں گے۔

مولف
مشتاق احمد قریشی

ہم شریف لوگ

جناب طغرل فرغان/ابن صفی

آپ یقین کیجیے کہ میں شرفا کے طبقے سے تعلق رکھتا ہوں ثبوت کے لیے میرے جوتے حاضر ہیں ان کی چمک دمک ملاحظہ فرمایئے میں دعوے سے کہتا ہوں کہ آپ ان میں اپنی شکل دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن ٹھہریے آپ نے تو الٹ پلٹ شروع کر دی نہیں ان کے تلے مت دیکھیے ان میں دو بڑے بڑے سوراخ ہیں جو نیچے ہی نیچے میرے تلووں میں غلاظت اور گندگی لپیٹے رہتے ہیں مئی جون کی آگ اگلتی ہوئی دھرتی انہیں سوراخوں کے ذریعے مجھے زندگی کا احساس دلاتی رہتی ہے۔ لیکن میں مطمئن ہوں صرف اس لیے کہ آپ تو صرف اوپر کے چمڑے کی چمک دمک دیکھتے ہیں۔

تو یقین کیجیے کہ میں متوسط طبقہ کا ایک خاندانی شریف ہوں مجھے یقین ہے کہ آپ ضرور یقین کریں گے کیونکہ آپ میرے جسم پر گیبروڈین کا سوٹ دیکھ کر یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ میرے معدے میں باجرے کی روٹی اور بینگن کا بھرتا سڑ رہا ہے۔

ارے آپ یہاں دھوپ میں سڑک پر کیوں کھڑے ہیں آیئے میری بیٹھک میں تشریف رکھیے۔

جی ہاں یہ کرسیاں بریلی سے منگوائی تھیں بھئی فرنیچر تو کچھ بریلی ہی میں بنتا ہے یہ قلمدان، یہ بھی تاریخی چیز ہے آپ نے خان بہادر فقیر بخش مرحوم کا نام تو سنا ہی ہوگا وہ میرے نانا کے سوتیلے چچا کے سالے کی خالہ کے داماد تھے یہ قلم دان انہیں لارڈ کرزن نے عطا فرمایا تھا۔

اور یہ اگلدان آپ یقین نہ کریں گے لیجیے سگریٹ پیجیے ہاں تو اس اگلدان میں نادر شاہ درانی نے پانی پیا تھا آپ ہنس رہے ہیں یقین کیجیے جب نادر شاہ نے دلی پر حملہ کیا تھا اس وقت یہ اگلدان گلاس کی شکل میں تھا اور نادر شاہ نے اس میں پانی پیا تھا بعد میں مغلوں نے نادر شاہ کی توہین کرنے کے لیے اسے اگالدان بنا دیا یہ تصویر میرے نانا نے پیرس کی بین الاقوامی نمائش میں ڈیڑھ ہزار پونڈ میں خریدی تھی اور یہ گلدان جی ہاں اس کمرے کے آگے صحن ہے لیکن میں ادھر کا حال آپ کو نہ بتاؤں گا اس طرف مرغیاں دن بھر کوڑے کا ڈھیر کرید کرید کر سارے صحن میں پھیلاتی رہتی ہیں میں آپ کو ہرگز نہ بتاؤں گا کہ اس طرف رکھے ہوئے پانی کے برتن کائی جمتے جمتے بالکل غلیظ ہو کر رہ گئے ہیں، جن میں کیچڑ اور دھول میں لپٹے ہوئے ننگ دھڑنگ بچے اپنے ہاتھ گھنگھولا کرتے ہیں میں پانی پینے کے ایلومونیم کے ان کٹوروں کا تذکرہ ہرگز نہ کروں گا جن کے گڑھے میل جمتے جمتے سیاہ ہو گئے ہیں۔

میں آپ کو اس کمرے میں نہ لے جاؤں گا جو زیادہ کشادہ نہ ہونے کے باوجود اللہ کی رحمت کے طفیل

دس بارہ آدمیوں کو پناہ دیتا ہے میں آپ کو اس کمرے میں لگی ہوئی الگنی پر لٹکے ہوئے وہ گندے لحاف ہرگز نہ دکھاؤں گا جو نسلاً بعد نسل کنبہ پروری کرتے ہوئے مجھ تک پہنچے ہیں۔

ہاں تو آپ اسی طرف رہیے اسی کمرے میں یہ قالین دیکھیے یہ تصویریں دیکھیے یہ قلم دان دیکھیے یہ گلدان دیکھیے اور یہ اگالدان سگریٹ لیجیے نا آخر تکلف کیسا؟

خیر تو ہاں جناب وقت کی بات ہے اب میں اپنے متعلق کیا عرض کروں بہرحال اتنا ضرور کہوں گا کہ بہت ہی شاہی قسم کا خون اب تک میری رگوں میں جوش مار رہا ہے یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے پیشہ شاہجہانی منتخب کیا ہے کلرکی اپنے بس کا روگ نہیں اور پھر اس قسم کی ملازمتوں میں رشوت لینی ہی پڑتی ہے حق حلال کی کوڑی اگر مل سکتی ہے تو صرف مدرسی کے پیشے میں لڑکوں پر حکومت الگ رہتی ہے اور پھر یہ تو میری اپنی صلاحیت اور قابلیت کی بات ہے کہ میں ترقی کرتے کرتے وزیر تعلیم تک ہو جاؤں۔ میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ اگر میں وزیر تعلیم ہو سکا تو یہ میرے صوبے کی انتہائی خوش نصیبی ہو گی میں ایک شریف اور وضع دار آدمی ہوں مجھے اپنی پچھلی زندگی ہمیشہ یاد رہے گی اس سے یہ فائدہ ہو گا کہ شعبہ تعلیم میں خصوصاً اساتذہ کی تنخواہوں کے سلسلے میں کافی بچت ہو گی جب اساتذہ اپنی تنخواہوں میں اضافہ کا مطالبہ کریں گے تو مجھے فوراً اپنی پچھلی زندگی یاد آ جائے گی آخر میں بھی تو ایک ہائی اسکول میں ٹیچر رہ چکا ہوں میری کتنی آمدنی تھی میرے کیا اخراجات تھے میرے بچے بھی تو ننگے گھومتے تھے میں بھی تو سال میں دو جوڑے کپڑے پہنتا تھا میں بھی تو پانچویں سال نئے جوتے خریدتا تھا پھر یہ اب کون سی آفت آ گئی کہ ٹیچروں کی ضروریات ہی پوری نہیں ہو پاتیں۔

جناب والا میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھ میں وزیر تعلیم بننے کی صلاحیتوں کی کمی نہیں اور پھر میری شکل تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔

آخر اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے خیر ہنسیے ہمارے پاس کھوکھلے قہقہوں کے سوا باقی ہی کیا بچا ہے ہم اس کے سوا کر ہی کیا سکتے ہیں کہ ایک دوسرے کو منہ چڑائیں خود کارٹون بنیں اور دوسروں کی بخیہ ادھیڑیں بہرحال زندہ دلی بہت بڑی نعمت ہے اس وسیع کائنات کا ڈکٹیٹر خود ایک بہت بڑا زندہ دل ہے ذرا ان حسین صورتوں کو دیکھیے ان بھرے بھرے سلگتے ہوئے رخساروں کو دیکھیے لیکن جب اس کی زندہ دلی جوش میں آتی ہے وہ انہیں بھی کارٹون میں تبدیل کر دیتا ہے بھرے بھرے رخسار پچک کر چھوارہ ہو جاتے ہیں زندگی سے بھرپور ہتھیلیں خشک ہو جاتی ہیں کھنکتی ہوئی رنگین ہنسی کھانسیوں میں تبدیل ہو جاتی ہے آپ ہنس رہے ہیں ہنسیے خوب ہنسیے ہنستے جائیے یہاں تک کہ آپ کو بھی کھانسی آنے لگے۔

میں خواہ مخواہ بور رہا ہوں آپ بھی کہتے ہوں گے کہاں پھنس گیا کیا کہا میری باتیں دلچسپ ہوتی ہیں جی شکریہ

لیکن مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میں آپ کی کوئی خدمت نہ کرسکوں گا اس کے سوا کہ اخلاقاً میں بھی آپ کی قابلیتوں کا اعتراف کر کے آپ کو دوبارہ اپنی تعریف کرنے کا موقع دوں آپ برا نہ ملیے گا مجھے آپ کے خلوص نیت پر شبہ نہیں میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میرا حلقہ احباب بہت وسیع ہے میرے دوست مجھے بے حد چاہتے ہیں اور کیوں نہ چاہیں جب کہ وہ مجھے اپنی محفل کا بھانڈ سمجھتے ہیں میں ان میں بیٹھ کر کبھی اپنا دکھڑا نہیں روتا، انہیں ہمیشہ ہنسنے ہنسانے پر مجبور کرتا رہتا ہوں ان سے کبھی ادھار نہیں مانگتا، اگر مجھ میں یہ سب نالائقیاں نہ ہوتیں تو یہ سب مجھے "بور" کے خطاب سے نوازتے اور ان میں سے کوئی مجھے منہ لگانا بھی پسند نہ کرتا۔

بہر حال آپ شوق سے میری تعریف کیجیے اگر مجھ میں ذرہ برابر بھی شرافت ہے تو اس کے بدلے میں اپنی کسی کتاب کا انتساب آپ کے نام سے ضرور کروں گا خیر چھوڑیے ان باتوں کو۔

آپ اس شہر میں اجنبی معلوم ہوتے ہیں آرام سے بیٹھیے آپ یہاں تنہائی سے اکتا رہے تھے یہ خانہ بے تکلف ہے میں آپ کو ہرگز یہ نہ محسوس ہونے دوں گا کہ آپ اس شہر میں اجنبی ہیں ذرا دھوپ کچھ اور ڈھل جانے دیجیے میں آپ کو یہاں کے تاریخی مقامات دکھانے کے لیے لے چلوں گا آپ کو تکلیف تو ہوگی اس الماری سے کوئی کتاب نکال لیے میں ابھی دس منٹ میں حاضر ہوا۔

آپ تنہائی میں اکتا گئے ضرور ہوں گے مجھے ذرا دیر ہوگئی بات ہی ایسی پیش آ گئی تھی خیر لیجیے چائے پی جیے چائے کی سیٹ کی پسندیدگی کا شکریہ، یہ سیٹ سلطان عبدالحمید والی ترکی نے پر دادا مرحوم کو بطور نذر پیش کیا تھا اس چائے دانی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں چائے جاڑوں میں ٹھنڈی اور گرمیوں میں گرم رہتی ہے ہاں تو صاحب کیا بتاؤں اس وقت آپ کو خواہ مخواہ تنہائی کی تکلیف اٹھانی پڑی مرے بچے بہت زیادہ شریر ہیں، چھوٹے صاحبزادے نے سو روپے کا ایک نوٹو تو ڑ مروڑ کر چوہے کے بل میں ٹھونس دیا جو بمشکل تمام نکل سکا اور ایسی حالت میں ہے کہ پچاس ہی روپے کا رہ گیا تھا اسی حماقت میں دیر ہوگئی (ابے الو کے پٹھے آخر تم یہ جان کر کیا کرو گے کہ میں اتنی دیر تک دودھ والے کی خوشامد کرتا رہا تھا کہ وہ بس آج اور ادھار دے دے کیونکہ یہ عزت کا معاملہ ہے)

ہاں تو جناب لیجیے سگریٹ حاضر ہے آپ بیٹھے بیٹھے اکتا گئے ہوں گے چلیے آپ کو یہاں کے تاریخی مقامات دکھا دوں۔

جی ہاں میرا شہر کافی خوب صورت ہے یہاں بڑے شاندار ہوٹل ہیں فرسٹ کلاس پکچر ہاؤس ہیں اور بہت سی حسین تفریح گاہیں ہیں لیکن اس عمارت کو دیکھیے یہ ایک تاریخی یادگار ہے آپ نہیں سمجھے تو سنیے یہ میرے اسکول کی عمارت ہے اس کی ابتدا ایک پھوس کے جھونپڑے سے ہوئی تھی اب یہ ایک عالیشان عمارت ہے یہ تاریخی یادگار اس لیے ہے کہ لوگ اس کے بانی کو گالیاں دیتے ہیں گالیاں اس لیے دیتے ہیں کہ جس اسکول کو

اس نے پھوس کے جھونپڑے سے شروع کیا اسے ہائر سیکنڈری اسکول کیوں بنا دیا اور اب اسے کالج بنانے کی فکر میں کیوں ہے اسے اس لیے برا بھلا کہتے ہیں کہ وہ ان کے بچوں کو متوسط طبقے کی گھریلو گندگیوں سے نکال کر بلندی کی طرف لے جانا چاہتا ہے لوگ اس لیے اس سے خار کھاتے ہیں کہ وہ اپنی پوزیشن کا خیال کیے بغیر اسکول میں جھاڑو تک دے ڈالتا ہے اب فرمائیے کہ یہ عمارت تاریخی یادگار ہے یا نہیں؟

صرف میرے ہی اسکول کی بات نہیں میں بچوں کے ہر تعلیمی ادارے کی عمارت کو تاریخی یادگار سمجھتا ہوں آپ پھر ہنس رہے ہیں آپ نے شاید ان اسکولوں میں دعا کا منظر نہیں دیکھا اسکول کی گھنٹی بجتے ہی سب لڑکے ایک قطار میں کھڑے ہو جاتے ہیں ایک لڑکا دعا پڑھتا ہے اور سب اسے دہراتے ہیں۔

''اے رب تو بزرگی والا ہے ہم سب کی جان تیرے قبضے میں ہے تو ہم کو نیک راہ پر چلا اور برائیوں سے دور رکھ۔''

یہ بچے روزانہ گراموفون کے ریکارڈ کی طرح اس دعا کو دہراتے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ گھر سے چرائے ہوئے پیسوں کا مصرف بھی سوچتے جاتے ہیں، ان میں سے کوئی اپنے ساتھی کی کتابیں چرا لینے کا پروگرام بناتا رہتا ہے اور کوئی کسی نیک لڑکے کو پٹوا دینے کے امکانات پر غور کرتا رہتا ہے تو بیٹے میں اس لیے ان عمارتوں کو تاریخی یادگار کہتا ہوں کہ انہی بچوں میں سے کئی قومی رہنما ہوں گے اور کئی حکومت کے بڑے بڑے عہدے سنبھالیں گے اس وقت تک یہ گھر سے چرائے ہوئے چند پیسے لاکھوں کی شکل میں تبدیل ہو چکے ہوں گے کتابوں کی چوری بلیک مارکیٹنگ کا روپ دھار چکی ہو گی اور یہ اپنے عہدوں کا حلف لیتے وقت کہیں گے۔

''ہم خدا کو حاضر و ناظرین جان کر عہد کرتے ہیں کہ ہمیشہ ملک کو قوم کو بھلائی کے لیے اپنے عزیزوں کو اچھی اچھی ملازمتیں دلوائیں گے ملک کی ترقی کے لیے اپنے بیٹوں کو سڑکوں کی تعمیر کے ٹھیکے دیں گے اپنی حکومت کو سربلند کرنے اور عوام میں مقبول بنانے کے لیے چور بازاری کی ہمت افزائی کریں گے ہم خدا کو حاضر و ناظر جان کر عہد کرتے ہیں کہ ملک کی ترقی کے لیے اپنی حکومت میں کسی ایماندار کا وجود برداشت نہیں کریں گے کیونکہ ایماندار لوگ اینگلو امریکن بلاک کی سیاست کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔''

ہاں تو جناب...... اب فرمائیے...... کیا میں ان عمارتوں کو تاریخی یادگاریں سمجھ کر غلطی کر رہا ہوں۔

اب آیئے میرے ساتھ یہاں شہر میں اب کوئی تاریخی یادگار باقی نہیں رہ گئی یہاں سے تین میل کے فاصلے پر صرف ایک تاریخی یادگار اور ہے کیا آپ پیدل نہ چل سکیں گے۔ معاف کیجیے گا میں بھول گیا تھا کہ آپ بھی میری ہی طرح ایک شریف آدمی ہیں خیر آیئے ایک تانگہ کیے لیتے ہیں۔

ارے آپ متحیر کیوں ہیں جی ہاں یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے یہاں ایک زبردست تاریخی یادگار ہے

ادھر آیئے آپ دیکھ رہے ہیں جی ہاں یہی وہ تاریخی یادگار ہے لیجیے آپ تو پھر ہنسنے لگے بخدا میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں اسی گندے تالاب کے کنارے ۱۹۴۲ء میں دیش سیوکوں پر گولیاں چلی تھیں اور وہ سامنے جو ایک جھونپڑا پڑا ہے وہاں ایک مشہور غنڈہ گمبھیر رہتا تھا وہ پیدائشی غنڈا نہیں بلکہ پیدائشی یتیم تھا بچپن میں بھوک نے اسے بدمعاش بنا دیا اور اس کی ساری عمر بدمعاشی میں گزر گئی، جب ۴۲ء کا اندولن شروع ہوا تو وہ بوڑھا ہو چکا تھا اس وقت اس کی زندگی میں زبردست انقلاب رونما ہوا اس نے گاؤں کے جوانوں کی رہبری شروع کر دی نجانے اس میں اچانک یہ تبدیلی کیسے ہوئی نجانے وہ ایک چور سے جنگ آزادی کا سپاہی کیسے بن گیا اس کے کچھ ساتھی مارے گئے اور وہ گرفتار کر لیا گیا۔

رہائی کے بعد وہ محنت کشوں کی طرح زندگی بسر کرنے لگا اسی تالاب کی مچھلیاں اس کی زندگی کا سہارا تھیں، وہ انہیں شہر لے جا کر ایسے داموں پر فروخت کرتا تھا کہ اس کے کنبے کی پرورش اچھی طرح ہو جاتی تھی۔

اور پھر آزادی آئی ملک ترقی کرنے لگا نئے نئے محکمے قائم ہوئے اور اس تالاب کے کنارے مچھلیوں کی پرورش و پرداخت کا بورڈ لگا دیا گیا اب اس میں مچھلیاں پکڑنا ایک بھاری جرم تھا بوڑھے رگھبیر کی آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا وہ کئی دن تک سوچتا رہا کہ اب کیا کرے آزادی نے اونچے مکانوں کے باورچی خانوں کے لیے مچھلیاں تو پالنی شروع کر دی تھیں لیکن بوڑھے رگھبیر کے لیے اس کے پاس سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہ تھا۔

رگھبیر نے فاقوں سے تنگ آ کر پھر چوری کی اور پکڑا گیا۔

تو جناب آپ کو ماننا ہی پڑے گا کہ یہ گندہ تالاب بھی ایک تاریخی یادگار ہے آخر آپ ہنستے کیوں ہیں کیا مجھے احمق سمجھتے ہیں۔

کان کھول کر سن لو، اب تاج محل، اجنتا، اور قطب مینار کو شہد لگا کر چاٹنے سے کام نہ چلے گا تمہیں کہنا پڑے گا کہ یہ گندہ تالاب جس میں وطن کے جانفروشوں کا خون لہرئیے ڈال چکا ہے یہ گندہ تالاب جس نے گورے آقاؤں کے پنجے سے رہا ہوتے ہی ایک دیش سیوک کی روٹی چھین کر اسے دوبارہ چور بننے پر مجبور کر دیا ہندوستان کی سب سے بڑی تاریخی یادگار ہے کہو...... کہو...... کہتے ہو یا میں تمہارا گلا گھونٹ دوں......

اوہ معاف کیجیے گا دیوانگی میں آپ کی شان میں گستاخی کر بیٹھا، میں یہ بھول گیا تھا کہ آپ بھی میری ہی طرح متوسط طبقے کے ایک شریف آدمی ہیں ہمیں یہ باتیں ہرگز زیب نہیں دیتیں ہمیں اپنے آباؤ اجداد کی راہ سے نہیں ہٹنا چاہیے ہمارے آباؤ اجداد جو قصیدے کہہ کہہ کر بڑی بڑی جاگیریں حاصل کیا کرتے تھے آیئے ہم آپ بھی اللہ کا نام لے کر قصیدہ کہیں شاید اس پاک بے نیاز کی رحمت اسی کی منتظر ہو۔

اسے فضل کرتے نہیں لگتی بار

نہ ہو اس سے مایوس امیدوار

فرار

ابن صفی

طغرل فرحان (ابن صفی) ایک کامیاب طنز نگار ہیں ان کے طنز ہیں، شوخی، ظرافت اور
تلخی کا حسین امتزاج ہے ان کے ہر مضمون میں انفرادیت ہوتی ہے یہ انفرادیت نہ
صرف طرف فکر ہیں بلکہ اسلوب و انداز میں بھی برقرار رہتی ہے خیالات میں گہرائی
انداز میں دلکشی اور لہجے میں چبھن ان کے تمام طنزیہ مضامین کی خصوصیات ہیں۔

اور اب تو گدھے کو بری طرح غصہ آ رہا تھا پیچھا ہی نہیں چھوڑتے لونڈے کسی طرح کوئی پیٹ پر لاتیں جما رہا ہے کوئی ایال تھام کر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا کوئی دم اینٹھ رہا تھا کوئی بلند آواز سے سوچ رہا تھا کہ اس کی دم میں کنستر باندھ کر ایک موٹا سا ڈنڈا رسید کر دیا جائے اس انوکھی اور خطرناک تجویز پر دل لرز اٹھا اگر اس وقت اس کو دھوبی مل جاتا تو شاید وہ اس کا خون پی لیتا ایک تو دن بھر محنت لیتا ہے بھی کبھار اگر موج میں آ کر چھٹی بھی دی تو اگلی ٹانگوں میں رسی باندھ دیتا ہے۔ کوئی کہاں تک خشکہ کھائے ہرا بھرا کھیت دیکھ کر طبیعت للچا ہی جاتی ہے کھیت کی طرف رخ کیا موت کو دعوت دی کھیت والے سے بچ بھی جائے تو یہ لونڈے کہاں چھوڑتے ہیں کاش اگلی ٹانگیں بندھی نہ ہوتیں وہ وہ دولتیاں جھاڑتا کہ مزاج درست ہو جاتے یکا یک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کئی لڑکے ایک ساتھ اس کی پیٹھ پر سوار ہو گئے ہوں اور ساتھ ہی کسی موٹی سی مکھی نے بائیں آنکھ میں جہاں چیپڑ لپٹا ہوا تھا ڈنک مار دیا اس نے احتجاجاً اپنے بائیں کان کو جنبش دی اور دل ہی دل میں دھوبی کو گالیاں دینے لگا۔

"سور...... الو کا پٹھا...... ٹانگیں نہ جانے کیوں باندھ دیتا ہے۔ باز آیا ایسی سیر و تفریح سے مگر سیر و تفریح کیسی؟ ہریالی بغیر زندگی بھی تو اجیرن ہے صرف خشکے پر کیوں کر بسر ہو اس میں وٹامن کہاں، کلوروفل کہاں کئی بار کہا بطور ذیرکس ہری گھاس کا بھی اضافہ کر دے مگر لال پیلی آنکھیں دکھا کر "ڈی آئی آر" کی دھمکی دیتا ہے حرامی، سرمایہ دار کہیں کا الو کا پٹھا، کلوٹا کتا تو مزے اڑائے جو سالا گھر کا ہے نہ گھاٹ کا اور وہ جو دن رات خون پسینہ ایک کر کے اس کے ایوان مسرت کی بنیادیں رکھے اس طرح خواری کی زندگی بسر کرے آخر نجات کیوں کر ہو، کیا کیا جائے اب نہیں سہے جاتے مظالم۔

دفعتاً ایک تدبیر اس کے ذہن کے عقبی حصے سے شعور میں جھانکنے لگی، کیوں نہ گدھوں کی ایک میٹنگ کال کر کے بالاتفاق آرا ایک جماعت کی بنیاد ڈالی جائے، ایسی جماعت جو اپنے حقوق کے لیے لڑ سکے "دیئی بھوسہ" قسم کی تحریک شروع کر دے کے اپنے نمائندہ کا انتخاب کر کے آئین ساز اسمبلی میں اپنی آواز بھی پہونچا سکے...... اور وہ...... اور اس کا کیا پوچھنا...... تدبیر تو وہ سوجھی ہے کہ اگر کامیاب ہو گئی تو اس کا لیڈر بن جانا اتنا ہی یقینی ہے جتنا ایسی صورت میں دھوبی کا انتقال کر جانا، لیڈر کا دھیان آتے ہی اس نے اپنے دونوں کان کھڑے کر لیے بالکل اسی انداز میں جیسے ایک لیڈر تقریر ختم کرنے کے بعد دونوں ہاتھ جوڑ کر سامعین کو نمستے کرتا ہے......

اچانک ایک شریر لڑکے نے اس کے سر پر ایک موٹا سا لٹھ رسید کر دیا گدھے کی آنکھوں میں اندھیرا آ گیا اور اس

دھندلکے میں اسے بہت سی رنگ برنگی ساریاں نظر آئیں۔

ساریوں میں سے جھلکتی ہوئی نقرئی ٹانگیں رسیوں سے بندھی ہوئی تھیں دیکھتے ہی دیکھتے رنگین ساریاں، ہری بھری گھاس کے چھوٹے سے خطے میں تبدیل ہوگئی ایک لٹھ اور پڑا گدھا جھنجلا اٹھا "نانسنس" ایک پاس ٹھہرے ہوئے لڑکے سے کہا جو اپنے میلے کچیلے کرتے کی آستین سے بار بار ناک صاف کرتا تھا" بھلا میں ایسی صورت میں کیوں کر دوڑ سکتا ہوں جب کہ میری ٹانگیں بندھی ہوئی ہے۔" لڑکے نے آنا فاناً رسی کھول ڈالی گدھے نے" تھینک یو" کہتے ہوئے دولتی جھاڑی اور یہ جا وہ جا، دیکھتے ہی دیکھتے لونڈوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

کھائیاں اور نالے پھلانگتے پھلانگتے اس کی سانس پھول گئی تھی شہر کی چوڑی سڑک نظر آتے ہی اس نے اپنی رفتار اس لیے دھیمی کر دی کہ کہیں کسی فوجی لاری سے ٹکر نہ ہو جائے نہ جانے کیوں فوجیوں سے زیادہ اسے ان کی دیو پیکر لاریوں سے نفرت تھی...... جن میں نہ حسن نہ رنگینی...... بس بھر ربھر رکر کے فراٹے بھرتی ہیں...... اندھی کہیں کی...... اسے اپنی محبوبہ کا خیال آ گیا...... جس کی ایک ٹانگ انہیں اندھی لاریوں میں سے ایک کی نذر ہو گئی تھی اس کی چیخ سے بیچ بچاتی ہوئی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر مکھیوں کی قطاروں کو درہم برہم کرتے ہوئے رخساروں پر ڈھلک آئے...... ہائے رے مفلسی...... وہ اپنی محبوبہ کے لیے بیساکھیاں بھی تو نہ خرید سکا تھا اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے فورڈ موٹر فیکٹری کی موٹر ساز مشینوں کے پہیے اس کے ذہن میں تیزی سے گردش کر رہے ہوں...... موٹریں بن رہی ہوں اس کی محبوبہ کی ٹانگ میں یونین جیک لہرا رہا ہو...... مسٹر فورڈ بیساکھیوں کی مدد سے سڑک پر رینگ رہے ہوں......

"دھب" سلسلہ خیال ٹوٹ گیا...... اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایک بڑی سی جغادری بھینس کھڑی سینگیں تولتی نظر آئی...... غالباً ان خیالی میں وہ بھینس سے ٹکرا گیا تھا۔

"ساری میڈم۔" گدھے نے سہم کر کہا۔

"دیٹس آل رائٹ۔" بھینس نے مسکرا کر کہا اور پاس کے کیفے میں گھس گئی۔

"الو کی پٹھی۔" گدھا زیر لب بڑبڑایا...... بڑا ناز ہے سینگوں پر سالی کو...... سینگ...... وہ خود بخود چونک پڑا...... اگر سینگ مار دیتی تو...... ایک وہ ہے سینگوں سے محروم...... سینگوں کی عدم موجودگی ہی تو اس کی مظلومیت کا باعث ہے...... اگر سینگیں ہوتیں تو دھوبی بھی مساویانہ برتاؤ کرنے پر مجبور ہوتا...... اسے قدرت کی بے انصافی پر غصہ آ گیا...... بھینس ایک ناکارہ سی جانور...... تھان پر بندھے بندھے دودھ دینے اور چارہ کھانے کے علاوہ کس کام کی ہے...... اس پر تشدد بھی تو نہیں ہوتا آخر اسے سینگوں کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے اس غلط بخشی پر غصہ نہ آئے تو اور کیا ہو، بے انصافی کا یہ عالم ہے اور بنتے ہیں بھگوان...... اونہہ...... اس کے سینے میں جوالا مکھی پھوٹ پڑا قریب ہی فوجی خچر گاڑیاں جا رہی تھیں کیا شاندار زندگی ہے ان کی وہ سوچنے لگا ایک وہ ہے دھوبی کا گدھا جو گھر کا بھی اور گھاٹ کا بھی، مگر پھر بھی یہ حال کہ جہاں اب سے ایک ہزار سال پہلے تھا وہیں آج بھی ہے آخر کیوں؟ دھوبی محض دھوبی...... دھوبی ہی ان ساری ذلتوں کے ذمہ دار ہیں...... دھوبیوں کی خود غرضانہ اور سرمایہ دارانہ ذہنیت نے اس کی قوم کو آگے نہ بڑھنے دیا...... وہ گڑبڑا گیا...... ایک نوجوان خچرنی اسے آنکھ مار رہی تھی...... اس کے ذہن میں

غالب کا شعر گونج اٹھا۔

سادگی پرکاری بے خودی ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرات آزمایایا

لفٹ تو مل رہی ہے اس نے سوچا کیوں نہ اس سے رومانس لڑایا جائے اف یہ صاف شفاف آنکھیں، چمکدار سڈول بدن...... گدرائی ہوئی بانہیں......

اور کیا چاہیے محبت میں

اس نے اس گاڑی کے ساتھ چلنا شروع کر دیا جس میں وہ مچرنی جتی ہوئی تھی مچرنی کا پارٹنر گردن اکڑائے ہوئے بڑی شان سے چل رہا تھا، وہ ایک زبردست مچر تھا اس دیکھ کر گدھے کو احساس کمتری ہونے لگا اور خوف بھی معلوم ہونے لگا کہ کہیں پٹائی نہ کر بیٹھے پہلے تو اس نے سوچا کہ کہیں مچرانی احمق تو نہیں بنا رہی، بھلا اس مچر کے سامنے اس کی کیا ہستی ہے مگر پھر یہ سوچ کر کہ محبت دو روحوں کے اتصال کا نام ہے نہ کہ دو جسموں کے اتصال کا اس نے اپنے دل کو ڈھارس بندھائی اور خود بھی ماڈرن فاکس ٹراٹ کی دھن میں سیٹی بجاتا ہوا اکڑ اکڑ کر چلنے لگا۔

"اوہ...... ویری سوئٹ۔" مچرنی نے اس کی طرف سر گھما کر آہستہ سے کہا۔

"شرمندہ کر رہی ہیں آپ۔" گدھے نے سیٹی روک کر جاتے ہوئے کہا۔

"نہیں واقعی ہو بہو وہی اسٹائل ہے کیا پرسوں آپ فیریز رنگ میں تھے؟" مچرنی بولی۔

"وہاں تو میں ہر ہفتہ جاتا ہوں۔" گدھے نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ میں نے آج تک کوئی پروگرام مس نہیں کیا۔

"اوہ، ون ڈلائٹیڈ ٹو سٹ یو۔" مچرنی نے جلدی جلدی پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

مچرنی کے پارٹنر نے دم اٹھا کر چند غصیلی آوازیں نکالیں اس پر مچرنی اس کی طرف دیکھ کر اس طرح آنکھ ماری گویا گدھے کو الو بنا رہی ہو...... اس کے پارٹنر نے مسکرا کر دم نیچے کر لی۔

"کیوں نہ ہم لوگ آرلکچو میں چل کر ایک ایک گلاس شیری پئیں۔" گدھے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نو تھینکس۔" مچرنی نے سادگی سے جواب دیا۔

"میں اس وقت بہت بزی ہوں البتہ کل اسی وقت وہاں مل سکوں گی۔"

"بہتر۔" گدھے نے کان ہلاتے ہوئے کہا۔

"قطعی۔" مچرنی بولی۔

"خیریو۔"

"چیریو۔"

مچر گاڑیاں ایک طرف ہو لیں گدھا اس وقت وہاں کھڑا رہا جب تک کہ وہ دوسری طرف نہ مڑ گئیں۔

کل کی شام ایک حسین شام ہے وہ سوچنے لگا مگر حیرت تو اس پر ہے کہ وہ خوامخواہ اس کی طرف متوجہ ہی کیوں ہوئی اور پھر وہ تحسین آمیز انداز گفتگو ضرورت ہی کیا ہے اس موضوع پر کچھ سوچا جائے اس سے کیا غرض کہ ایسا

کیوں ہوا..... بہرحال ہوا..... آج کی مشغول دنیا میں "کیوں" کا سوال اتنا ہی دقیانوسی ہے جتنا کہ اس خرابے کا نام دنیا ہی کیوں رکھا گیا..... آموں کی اس مقدار سے مطلب جو پیٹ کی نظر ہو رہی ہے نہ کہ پیڑ گننے سے۔

"بڑے مگن نظر آ رہے ہو۔" پیچھے سے آواز آئی۔

وہ چونک پڑا اس کا حریف دھوبی کا کتا زبان نکالے کھڑا ہانپ رہا تھا۔

"جی۔" گدھے نے روکھے پن سے کہا۔

کچھ ناراض معلوم ہوتے ہو۔" کتا مسکرا کر بولا۔

"جی ہاں...... پھر......؟" گدھے نے کتے کو تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"مزاج درست ہیں یا نہیں؟" کتے نے دم ٹیڑھی کرتے ہوئے کہا۔ "نہ جانے خود کو کیا سمجھتے ہو۔"

"دیکھو مجھ سے تمیز سے بات کیا کرو...... کئی بار سمجھا چکا ہوں۔" گدھا تیزی سے بولا۔

"اچھا" اب کتے کی دم اس کی کمر پر دائرہ بنا رہی تھی۔ اور نچلے جبڑے کی کوریں تھرتھرانے لگی تھیں غراہٹ آہستہ آہستہ بلند ہو رہی تھی قبل اس کے کہ وہ گدھے پر جھپٹے ایک بڑے موٹے انگریز کا گرے ہاؤنڈ اس پر جھپٹ پڑا، دھوبی کے کتے کی دم سیدھی ہوگئی اور آہستہ آہستہ پچھلی ٹانگوں سے گزرتی ہوئی پیٹ سے جا لگی، پچھلی ٹانگوں کے بل جھکتے ہوئے اس نے اپنے دانت نکال دیے گنجے انگریز نے پلٹ کر سیٹی بجائی اور گرے ہاؤنڈ دھوبی کے کتنے کی دم سونگھ کر پھر اس کے پیچھے ہولیا۔

"پردیسی سمجھ کر چھوڑ دیا ورنہ......!" دھوبی کے کتنے نے جھینپ مٹانے کی کوشش کی۔

گدھے نے قہقہہ لگایا۔ "بہت اچھا کیا ورنہ خوامخواہ ہندوستانی کتے بدنام ہو جاتے۔"

"چھوڑو بھی۔" کتے نے کہا "چلتے ہو کہیں۔"

"کہاں۔"

"ذرا دریا کی طرف۔" کتا پچھلی ٹانگ سے پیٹ کھجلاتے ہوئے بولا۔ "میں تو اکتا گیا ہوں ان آبادیوں سے۔"

"بس کرم کیجیے۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر آیا ہوں۔" گدھے نے داہنی ٹانگ کے اوپری جوڑ پر کی کھال کو ذرا سی جنبش دے کر کہا۔

"کیا مطلب۔"

"مطلب صاف ہے ہماری قوم بہت ہی امن پسند ہے ایک گدھا آج تک کسی دوسرے گدھے کے لیے مہلک ثابت نہیں ہوا اور نہ کبھی کسی گدھے نے یہی کوشش کی کہ دوسرے پر اپنی برتری کا رعب ڈالے ہم سب برابری اور بھائی چارے کے قائم ہیں ہم سب وہی کھاتے ہیں جو ایک کھاتا ہے ہم سب بڑی محنت کے عادی ہیں۔ اونچ نیچ کے جراثیم سے ہماری قوم ہمیشہ پاک و صاف رہی ہے۔"

"ذرا ٹھہرو۔" کتنے نے بار بار اپنی آنکھ پر حملہ کرتی ایک مکھی کو ہڑپ کرتے ہوئے کہا۔

"آخر اس لیکچر کا مطلب۔ تم ہمیشہ سے چھیڑ چھیڑ کر لڑتے چلے آئے ہو ان ساری باتوں کا مفہوم سوائے میری

قوم کی تذلیل کے اور کیا ہوسکتا ہے مجھے تسلیم ہے کہ میری قوم ان تمام خوبیوں کے مخالف نقائص کی حامل ہے مگر تمہیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ہم اس کے لیے مجبور ہیں کچھ قدیم روایات اور کچھ تقاضائے فطرت کی بنا پر ہم آج تک اپنی ان عادات سے پیچھا نہ چھڑا سکے بتکلف برطرف سچ پوچھو تو یہ ہمارے لیے باعث فخر ہیں باعث فخر اس لیے کہ یہ نظام قدرت ہی ہمیں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا سبق دیتا ہے رہا بھائی چارہ والا معاملہ تو یہ سب بناوٹ اور جھوٹ ہے اس قسم کا کوئی نظام کبھی دیرپا ثابت نہیں ہوا جو نظام قدرت کے خلاف ہو، بھائی چارہ قسم کی تحریکیں، عارضی اور وقتی ضرورت کی ایجاد ہیں اور......

اماں پوری بات تو سنی ہوتی تم تو بیچ ہی سے لے اڑے میں اس وقت سیاسی گفتگو کے موڈ میں نہیں ہوں میں یہ کہہ کر رہا تھا کہ میری قوم میرا حریف نہیں پیدا کر سکتی...... میرا حریف اگر کوئی ہوسکتا ہے تو وہ صرف انسان ہے اور دریا کی طرف لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے درمیان اس حریف کا سامنا یقینی ہے کیوں کہ وہاں پہنچ کر میرے لیے اپنے فطری حق کے لیے جدوجہد ضروری ہو جائے گی...... فطری حق سے میری مراد ہریالی ہے۔

اور یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ حق طلبی اور لاٹھی چارج میں کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا...... تف ہے...... خدا دشمن کو بھی انسان نہ بنائے اس سے تو کتے ہی بھلے۔"

"دیکھو دیکھو تم نے پھر وہی چھیڑ چھاڑ شروع کی۔" کتے نے کہا۔

"تم تو ہو نرے آدمی۔" گدھا گردن جھٹک کر بولا۔ "ارے بابا میرا مطلب یہ ہے کہ مجھے انسانوں سے زیادہ کتے پسند ہیں۔"

"خیر مارو گولی...... چلنے کی کیا رہی۔" کتے نے چاروں ٹانگیں آگے پیچھے پھیلا کر ایک طویل انگڑائی لی۔

"کہہ تو دیا۔" گدھے نے لاپروائی سے کہا۔

"اس کی فکر نہ کرو۔" کتا بولا۔ "اگر تمہاری طرف کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو اس طرح کاٹوں گا کہ سالا پاگل ہو کر مرے۔"

"یہ بات، تو آؤ۔" گدھے نے اپنے بائیں پہلو پر دم رسید کرتے ہوئے کہا۔

دونوں آہستہ آہستہ دریا کی طرف چل پڑے راستہ بھر تفریحی گفتگو ہوتی رہی گدھے نے کتے کو اپنے آج والے معاشقہ کی داستان خوب مزے لے لے کر سنائی کتا راستہ بھر کتیوں کو دیکھ دیکھ کر دانت جمائے "کوں کوں" کرتا رہا۔ گدھا اس کی حرکت پر اسے ڈانٹتا جا رہا تھا۔

"تمہاری یہی لوفرانی تو مجھے ناپسند ہے۔"

"واہ بیٹا...... تم کرو تو عاشق اور میں کروں تو لوفر کہلاؤں...... آ گئے نہ اصلیت پر؟ اے صاحبزادے پھر کہتا ہوں کہ یہ برابری اور بھائی چارہ سب ڈھونگ ہے اس وقت تم نے بالکل آدمیوں جیسی حرکت کی ہے آدمیوں میں رہ کر تم کسی طرح اپنا گدھا پن برقرار نہیں رکھ سکتے...... کچھ نہ کچھ آدمیت آ ہی جائے گی...... ان حضرت انسان کا بھی عجیب حال ہے اگر کسی رئیس کی لڑکی کسی مرد کے ساتھ جنسی تعلق قائم کر لیتی ہے تو محبت کرنے والی کہلاتی ہے اگر کوئی غریب لڑکی اس فطری تقاضے کو روکنے میں کامیاب نہ ہوئی تو جانتے ہو وہ کیا ہو جاتی ہے...... وہ کہلاتی ہے

آوارہ اور آبرو باختہ۔"

"اونہہ...... گدھے نے کان ہلا کر کہا۔

"پھر بور ہونے لگے سنو میں نے ایک بلینک ورس کہی ہے دونوں دریا کے کنارے سرسبز کھیتوں میں پہنچ چکے تھے چاروں طرف سناٹا تھا گدھے نے موقع مناسب جان کر منہ مارنے شروع کیے خوش قسمتی سے کتے کو بھی قریب ہی ایک بکری کے بچے کی سڑی لاش دستیاب ہوگئی۔

"ہاں وہ تمہاری نظم کا کیا ہوا...... سنا چلو۔" کتے نے قریب بیٹھے ہوئے گدھوں اور کوؤں کو دھمکی دے کر بڑی سی بوٹی نگلتے ہوئے کہا۔

"ہوں...... سنو۔" گدھے نے سر ہلا کر منہ چلاتے ہوئے کہا۔ نظم کا عنوان ہے فرار۔

سرمئی رات ابھی اور بھی کجلائے گی

سرمئی رات ابھی اور......

کوئی زنجیر گراں روک نہ پائے گی مجھے

لو چلا، یہ میں چلا، میں یہ چلا، میں یہ چلا

"بہت خوب کتے نے لاش کو جھٹکوں کے ساتھ ادھیڑتے ہوئے کہا۔" مکرر ارشاد۔"

"پھر وہی رسمی اور دقیانوسی باتیں۔" گدھے نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔" کیا تم نے مجھے بھی کوئی مشاعرے کا شاعر سمجھا ہے۔"

گدھا سر جھکا کر چرنے کا سلسلہ دوبارہ قائم کرنے ہی جا رہا تھا کہ ایک بھناتا ہوا لٹھ ایک ناقابل تحریر جوابی بلینک ورس کے ساتھ اس کے سر پر پڑا۔

"ارے باپ رے باپ۔" کہہ کر گدھے نے چھلانگ لگائی، کتے کے منہ سے بلبلاہٹ بلند ہوئی، اچھلتے وقت گدھے کی ٹانگیں اس کے سر پر پڑی تھیں۔

"ٹھہر تو جانا۔" کتے نے گدھے کے پیچھے دوڑتے ہوئے کہا۔

"وہ تو میں جانتا ہی تھا کہ تیرے دل میں کینہ ہے کتنا ہی محبت کا برتاؤ کروں پر تیرے دل سے دشمنی کی لکیر نہیں مٹ سکتی اچھا بیٹا کھال نہ کھینچ لی ہو تو سہی...... جاتے کہاں ہو؟" گدھے پر بدحواسی طاری تھی بغیر کچھ کہے ہوئے اپنی پوری قوت سے دوڑ رہا تھا غلط فہمی نے کتے کو بھی اس کا دشمن بنا دیا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ اگر آدمی کے لٹھ سے بچ بھی گیا تو یہ کتا کب چھوڑتا ہے افق میں بڑھتی ہوئی دھندلاہٹ نے دونوں کو اپنے دامن میں چھپا لیا۔

یادوں کی بارات

شاہد منصور

جولائی کا مہینہ دھیرے دھیرے قریب آتا جارہا ہے۔ ابن صفی کی یادوں کا قرض جاں سر پر سوار ہے۔ اپنی کوتاہی کا احساس ہے کہ کئی برس سے اس یار طرح دار کی بارگاہِ نیاز میں حاضری نہیں دے سکا۔ ادھر عزیزم مشتاق سلمہ بھی کئی مرتبہ توجہ دلا چکے ہیں بلکہ اظہر کلیم نمبر میں میری فرمائش پوری کرتے ہوئے مجھ سے ابن صفی کے بارے میں یادداشتیں لکھنے کی جوابی فرمائش بھی کر چکے ہیں مگر میں بھی کیا کروں کہ عمر نے حافظے پر نسیاں کے کہر کا کچھ ایسا دبیز پردہ ڈال رکھا ہے کہ اب خود سے کوئی بات یاد نہیں آتی۔ خصوصاً اس وقت جب لکھنے بیٹھو۔ ویسے تو حافظہ اس یار دلنواز کی یادوں سے ابلتا رہتا ہے مگر جب لکھنا چاہوں تو سادہ ورق ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر کوئی یاد دلا دے یا کسی موقعے کی مناسبت نصیب ہو جائے تو وہ ساری باتیں حافظہ میں کچھ ایسے روشن ہو جاتی ہیں جیسے بادل کو پھاڑ کر چاند نکل آتا ہے۔ یوں تو یہ صحیح ہے کہ ابن صفی کا اور میرا کم وبیش تقریباً اٹھائیس سال کا ساتھ رہا ہے اور اس عرصے میں ان سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں ملاقاتیں رہی ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ہم شریک رہے ہیں۔ کبھی ہم نے گھنٹوں ساتھ بیٹھ کر ایک دوسرے سے دنیا جہاں کی باتیں کی ہیں اور کبھی پہروں ایک دوسرے کی خاموشی کا بھی لطف اٹھایا ہے مگر یہ توقع یا خدشہ کس کو تھا کہ کبھی ہم جدا بھی ہو جائیں گے اور جدائی بھی ایسی کہ جو قیامت تک دائمی جدائی ہے۔ ہاں اگر کبھی بھولے سے بھی اس فراق کا احساس ہو جاتا تو ان باتوں کو یاد رکھنے کی کوشش کرتے بلکہ لکھ ہی لیتے۔ اب تو وہ ساری باتیں ایک بھولی ہوئی خوشبو کی طرح یاد ہیں اور خوشبو کو کون لفظوں میں بیان کر سکا ہے۔ پھولوں کو سونگھا تو سب ہی نے ہوگا اور خوشبو کا لطف بھی اٹھایا ہوگا مگر پوچھا جائے کہ وہ خوشبو کیا تھی تو سوائے مشام جاں معطر ہو جانے کے احساس کے اور کچھ بھی نہ کہا جا سکے گا تو میں بھی ابن صفی کی بھولی ہوئی یادوں کی چند جھلکیاں پیش کر کے آپ کے مشام جاں کو معطر کرنے کی کوشش کروں گا کہ شاید اس خوشبو کے ہالے میں آپ کو بھی اس یار عزیز کا چہرہ نظر آ جائے اور کوئی تصویر بن جائے۔

......☆......

ابن صفی کا شاعرانہ ذوق کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اگرچہ بدقسمتی سے ان کا دیوان ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکا کہ (اے کاش کہ وہ میری زندگی ہی میں چھپ جائے اور میری بجھتی ہوئی پیاسی آنکھیں اس کا دیدار کر کے تسکین پا سکیں (یہ مضمون چونکہ اگست 1993ء میں لکھا گیا تھا اور تب ہی نیا

رخ میں شائع ہوا تھا لیکن اب محترم ابن صفی صاحب کا شعری مجموعہ مطاع قلب ونظر شائع ہو چکا ہے مگر نئے افق کے اوراق کے ذریعے ان کے کلام کا خاصا بڑا حصہ چھپ چکا ہے) اور مجھے معلوم ہے کہ لوگ جس طرح نئے افق میں ان کا ناول اور تزک دو پیازی ذوق وشوق سے پڑھا کرتے تھے اسی طرح ان کے صفحۂ دل کے بھی مشتاق رہتے تھے۔ سچ پوچھا جائے تو ابن صفی کے ادبی سفر کی ابتدا ہی شاعری سے شروع ہوئی۔ طنز نگاری' مزاح نگاری اور سراغ نگاری سب ان کے نقش ثانی ہیں۔ سب سے پہلے وہ اسرار ناروی کے نام سے ہی بحیثیت شاعر منظر عام پر آئے تھے' طغرل فرغان' سنکی سولجر' عقرب بہارستانی اور ابن صفی کے چہرے انہوں نے حسب ضرورت بعد میں اپنے چہرے پر چڑھائے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ابن صفی کے نام نے وہ لازوال شہرت حاصل کر لی کہ باقی سارے نام ماند پڑ گئے۔ یہ قبول عام خدا تعالیٰ کی دین ہے اس پر کسی کا اجارا نہیں اور نہ کوئی بزور قوت بازو اسے حاصل کر سکتا ہے بہر حال ابن صفی بنیادی طور پر شاعر تھے اور ساری عمر وہ کبھی اپنے شاعر ہونے پر شرمندہ نہیں ہوئے۔ یہ الگ بات ہے کہ مشاعرہ باز نہ ہونے کی وجہ سے اور انجمن ہائے تحسین باہمی کے ممبر نہ بننے کے باعث وہ اپنی شاعرانہ حیثیت میں زیادہ مشہور نہیں ہو سکے مگر ان کا ذوق سخن بے حد اعلیٰ تھا جس کا اظہار ان کی غزلوں اور نظموں سے ہوتا ہے۔ یہاں میں خصوصیت کے ساتھ ان کی ایک بے پناہ نظم ''ہوشربا'' کا ذکر کرنا چاہوں گا جو مولانا حالی کے لافانی مسدس اور علامہ اقبال کی طلوع اسلام کے قبیلے کی نظم ہے۔ میرا خیال ہے کہ مرحوم کا دیوان چھپنے کے بعد اس نظم کی عظمت اہل نظر سے چھپی نہیں رہے گی۔ تو جیسا کہ میں عرض کر رہا تھا کہ مرحوم بنیادی طور پر شاعر تھے وہ جیسی خوبصورت نظمیں اور غزلیں کہتے تھے اسی پائے کے برجستہ گو طنز نگار بھی تھے اور اس فن میں انہوں نے کمال حاصل کر لیا تھا۔ اکثر کسی اچانک واقعے کی مناسبت سے ایسا طنز میں ڈوبا ہوا شعر کہہ جاتے کہ سننے والے پھڑک کر رہ جاتے تھے۔ افسوس کہ ان گنج ہائے گرانمایہ کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہیں کی گئی ورنہ خاصے کی چیز اور ادب کی آبرو ہوتے ایسا ہی ایک شعر جو اتفاقاً حافظے میں محفوظ رہ گیا ہے آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

۱۹۷۹ء کا زمانہ تھا۔ جنرل ضیاء کے اقتدار کو دو برس گزر چکے تھے۔ ابن صفی کے دفتر میں اچھا خاصا جمگھٹا تھا اسی دن بھٹو صاحب کی پھانسی کی خبر آئی تھی جو اس دن کی گرم ترین خبر تھی۔ لہٰذا ابن صفی کے دفتر میں بھی خبر گرما گرم......

گفتگو کا موضوع بنی ہوئی تھی حاضرین میں بھٹو مرحوم کے حامی بھی تھے اور جنرل ضیاء کے بھی جن لوگوں نے وہ دور دیکھا ہے وہ اس تلخی کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں جو اس گفتگو میں تھی۔ ابن صفی خاموش بیٹھے سب کی سنتے رہے مگر جب گفتگو حد سے گزرنے لگی تو مرحوم خاموشی سے اٹھ کھڑے ہوئے ان کے

اس طرح اچانک اٹھ کھڑے ہونے سے محفل بھی درہم برہم ہوگئی۔ مرحوم نے اسی خاموشی کے ساتھ دفتر بند کیا اور گھر کی طرف چل پڑے میں ہمراہ تھا تھوڑی دیر تک خیالوں میں ڈوبے ہوئے گم صم چلتے رہے پھر اچانک میری طرف مڑے اور آہستہ سے بولے۔

یہ تو جنگل ہے یہاں ہے کون کس کا آشنا
بھیڑیے نے بھیڑیے کو پھاڑ ڈالا بات ختم

......☆......

زمانے کا کچھ عجب دستور ہے کہ بعض چیزوں کے نام کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد اس طرح بدل جاتے ہیں کہ پچھلا نام اجنبی بن جاتا ہے اور نیا نام قبول عام کی سند حاصل کر لیتا ہے۔ بعض اوقات یہ تبدیلی بغیر کسی وجہ کے اپنے آپ ہی ہو جاتی ہے اور کبھی شے مذکور میں کسی تغیر وتبدل کے باعث ہوتی ہے کہنا یہ ہے کہ فاسٹ فوڈ اور برگر کے نام پاکستانی شہروں کے لیے ہرگز اجنبی نہیں تھے ہر بڑے شہر میں فاسٹ فوڈ کی درجنوں دکانیں کھلی ہوئی ہیں جہاں برگر بڑے شوق سے کھائے جاتے ہیں حالانکہ ابھی چند سال پہلے دوسرے شہروں کا کیا ذکر خود عروس البلد کراچی میں کوئی برگر کا نام نہیں جانتا تھا ہاں اس وقت بن کباب ضرور بکتے تھے اور خوب کھائے جاتے تھے مگر انہیں برگر کوئی نہیں کہتا تھا اب انہیں سیدھے سادے بند کبابوں کو سلاد کے پتے کے ایک دو ٹکڑوں اور ٹماٹروں کے ایک آدھ قتلے کے اضافے نے برگر بنا دیا ہے اور برگر بن کر ان کی قدر ہی نہیں قیمت بھی بڑھ گئی ہے۔

فیلڈ مارشل ایوب خان کا زمانہ تھا ٹھیک سال یاد نہیں غالباً ۶۲ یا ۶۳ تھا جب پاکستانی قوم پہلے پہل برگر کے لفظ سے آشنا ہوئی اور آشنا کرانے والے تھے مشہور شاعر اور کالم نویس جناب جمیل الدین عالی اور مرحوم ابن انشاء اس زمانے میں یہ دونوں حضرات گلڈ کی تشکیل سے فارغ ہو کر غالباً یونسکو کی دعوت پر یورپ اور امریکہ کے دورے پر گئے تھے اور دونوں حضرات کے سفرنامے بڑے تواتر اور اہتمام سے جنگ کراچی میں چھپ رہے تھے ان سفرناموں میں اور تو جو کچھ تھا سو تھا مگر ان میں تین مغربی کھانوں کے نام بڑے ذوق وشوق سے لیے جا رہے تھے یعنی برگر، اسا سیج اور ہاٹ ڈاگز دونوں حضرات کے سفرناموں میں نام تو تینوں کھانوں کے لیے جاتے تھے مگر برگر کا ذکر جتنی شدت اور والہانہ جوش وجذبے سے لیا جاتا تھا باقی دونوں کھانے اس سے محروم تھے۔ ان سفرناموں میں یہ برگر بھی کچھ عجیب قاضی الحاجات قسم کی چیز تھی کہ جب بھی ان سیاح حضرات کو بھوک لگتی تھی اور صاف ظاہر ہے کہ دن میں تین وقت تو لگتی ہی تھی تو سب سے پہلے برگر ہی ڈھونڈا جاتا تھا اور پھر مزے لے لے کر کھایا جاتا تھا مگر صاحب عجیب بے نیازی تو بلکہ اخفا تھی کہ ان کی تحریر میں برگر تو ہوتا تھا مگر بقول مرحوم اکبر الٰہ آبادی یہ

ہرگز نہیں بتایا جاتا تھا کہ کہاں رکھی ہے روئی رات کی یعنی اس برگر کے اجزائے ترکیبی پر بڑی ہوشیاری سے کبھی روشنی نہیں ڈالی جاتی تھی کہ آخر وہ ہے کیا چیز تو جناب اس برگر بازی نے سارے شہر کو الجھا رکھا تھا لوگ سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے برگر کے بارے میں پوچھتے تھے تو انکشاف ہوتا تھا کہ جتنا بقراط ایک ہے اتنا ہی بقراط دوسرا بھی ہے ارے سچی بات یہی ہے کہ ابن صفی اور ہم بھی دونوں انہیں بقراطوں میں شامل تھے ہم دونوں میں بار بار موزوں برگر پر حکیمانہ گفتگو ہوئی مگر معمہ حل نہ ہو سکا گرمیوں کے دن تھے ایک روز دوپہر کو میں دفتر سے گھر آیا اور کھانے کے انتظار میں کپڑے بدل کر ہاتھ منہ دھو کر پنکھے کے نیچے بیٹھ گیا اچانک دروازے پر ایک کار آ کر رکی اور دستک کی آواز آئی بیٹے نے آ کر بتایا کہ ابن صفی چچا آئے ہیں مجھے حیرت ہوئی کہ ناوقت کیوں تشریف آوری ہوئی ہے۔ بیٹے سے کہا کہ اندر بلا لو مگر جواب آیا کہ آپ کو بلا رہے ہیں اٹھ کر باہر گیا تو موصوف ڈپٹ کر بولے کہ ایسے ہی کیوں چلے آ رہے ہو جاؤ کپڑے بدل کر آؤ دیر ہو رہی ہے۔ عرض کیا کہ بندہ خدا ابھی دفتر سے آیا ہوں کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ آؤ بیٹھو ابھی چلتے ہیں مگر موصوف نے پہلے کب ہماری سنی تھی جواب سنتے ان کا حکم تو نادر شاہی حکم ہوتا تھا۔ لہٰذا کپڑے بھی بدلنا پڑے اور جانا بھی پڑا۔ خیال تھا کسی نشست میں جا رہے ہیں جہاں جانا موصوف بھول گئے تھے اور اب اچانک یاد آیا ہے چنانچہ بطور احتجاج میں بھی خاموش بیٹھا رہا مگر جب گاڑی صدر کی طرف مڑنے لگی تو موصوف کی آنکھیں ہیروں کی طرح جگمگائیں اور چہرے کو ایک چوڑی سی مسکراہٹ میں لپیٹ کر انہوں نے اطلاع دی کہ ہم برگر کھانے جا رہے ہیں میں واقعی اچھل پڑا۔ بولے کہ شاید آج کا اخبار تم نے نہیں پڑھا ہے ورنہ اتنا حیران نہ ہوتے پھر وضاحت سے بتایا کہ صدر میں ایک نیا ریستوران کھلا ہے فلیمنگو نام کا اور ان کی اسپیشلسٹی برگر ہے بہرحال ہم دونوں فلیمنگو پہنچے اچھا ائرکنڈیشنڈ ریستوران تھا بیٹھتے ہی برگر اور کافی کا آرڈر دیا گیا مگر جب بیرہ برگر لے کر آیا تو کچھ نہ پوچھیے کیا حال ہوا ہمارا۔ دونوں نے پہلے برگر کی طرف دیکھا پھر ایک دوسرے کی صورت دیکھی اور پھر اس بری طرح ہنسے کہ ریستوران کے منیجر کو ہم پر اختلال ذہنی کا گمان ہوا۔ ویسے شکر ہے وہاں اس وقت کوئی ہمارا صورت آشنا موجود نہیں تھا۔ بہرحال اس سانحے کے مہینوں بعد تک ہمارا یہ حال تھا کہ شام کو بند کباب کی دکان کے پاس سے گزرتے ہوئے ہم دونوں پر ہنسی کا دورہ پڑ جاتا تھا اور لوگ حیرت سے ہمیں دیکھتے رہ جاتے تھے کہ کیا ان کا دماغ چل گیا ہے۔

انسانی معاشروں میں امیر غریب کی تفریق اور آویزش غالباً انسانی تمدن کے ابتدائی دور میں ہی شروع ہو گئی تھی اور پھر جیسے جیسے معاشرے نے ترقی کی یہ خلیج بھی بڑھتی چلی گئی جس کے واضح ثبوت نہ صرف سمیری بابلی اشوری مصری ہندو پارسی کنعانی یونانی اور رومی آثار قدیمہ سے ہی ملتے ہیں بلکہ آسمانی

کتابوں توریت زبور انجیل اور قرآن سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے اور قرآن پاک میں تو اس سلسلے
میں بڑے واضح اصول و احکامات موجود ہیں جن پر عہد سعادت اور عہد خلافت راشدہ میں عمل کر کے
ساری دنیا کو ایک زریں فلاحی معاشرے کا جگمگاتا نمونہ دکھایا گیا تھا اور اگر آج بھی ان اصولوں اور
احکامات پر حسن نیت اور خلوص سے عمل کیا جائے تو دنیا ایک بار پھر وہی سنہرا نظارا دیکھ سکتی ہے بہر حال
امیر غریب کی یہ تفریق و آویزش انسانی معاشرے کا ایک ایسا حصہ ہے جس کے اثرات شعر و ادب پر بھی
ہمیشہ مرتب ہوتے رہے ہیں اور جس کی مثالیں فارسی اور اردو کے نثری اور شعری ادب میں عام ہیں
جہاں زر پرستی کے خلاف عام آواز اٹھائی جاتی رہی ہے اور ذخیرہ اندوزی اور احتکار کے خلاف کھل کر
تلقین کی جاتی رہی ہے اور ہر طرح کے ظلم کو روکنے اور برا کہنے کی تاکید کی جاتی رہی ہے مگر ۱۹۳۶ء میں
اردو ادب ایک بالکل نئے تجربے سے دوچار ہوا۔ یہ تجربہ ترقی پسند تحریک کا قیام تھا اس تحریک کی ادب
میں ابتدا ایک دھماکے کے ساتھ شروع ہوئی جس کا نام انگارے تھا اور ان انگاروں کی آنچ نے دیکھتے
دیکھتے پورے برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ انسان دوستی' بے غرضی' جاگیرداری' سرمایہ داری' غربت'
بھوک' ظلم و ستم' غلامی' آزادی یہ سارے موضوعات صدیوں سے ادب کا حصہ بنتے چلے آئے تھے مگر ترقی
پسند تحریک نے ان موضوعات کو ایک نیا جارحانہ لہجہ عطا کر کے انہیں وقت کی آواز بنا دیا اور ہمہ گیر
مقبولیت بخش دی تھی ان کے ساتھ ہی جب سلطانی جمہور کا دلفریب نعرہ زبان زد خاص و عام ہوا تو عوام
ایک نئی روشن چمکیلی صبح کے انتظار میں بے چین اور بیتاب ہو گئے یہ کسی خیالی جنت اوٹوپیا کی بشارت نہی
تھی بلکہ اس کے لیے بڑی چالاکی اور چابکدستی سے سوویت یونین کو کیمونسٹ نظام کی دلکش جنت کی
حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا۔ سوویت یونین مزدوروں اور کسانوں کی جنت جہاں عظیم باپ اسٹالن دودھ
اور شہد کی نہروں پر بیٹھا ہوا اسی دنیا میں فوز و فلاح بانٹ رہا تھا یہ وہی سوویت یونین تھا جو اپنے نظام کے
ناقابل برداشت بوجھ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ماضی کا افسانہ بن چکا ہے اور وہاں کے مزدوروں اور
کسانوں نے کیمونسٹ نظام کے جبر و استبداد سے تنگ آ کر خود ہی اسے زمیں بوس کیا ہے مگر ترقی پسند
تحریک پروپیگنڈے کے فن سے بخوبی واقف تھی چنانچہ اس کے کار پردازوں نے نہ صرف یہ کہ سوویت
یونین کی ظلم و جبر سے کراہتی ہوئی سرزمین کو اپنے پروپیگنڈے سے جنت بنا کر دکھا دیا تھا (اگر کسی
کو شک ہو تو فیض مرحوم کی سہ وسال آشنائی پڑھ لے) بلکہ اسٹالین جیسے چنگیز و ہلاکو کو عظیم باپ نمبر دو کی
سند پر بھی بٹھا دیا تھا اس تحریک نے جو کام کیے سو کیے مگر اس کا سب سے اہم کارنامہ ادب کی دنیا سے
مذہب کو بالخصوص اسلام کو رخصت کرنا تھا کیونکہ کیمونزم کی شریعت میں مذہب افیون تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا
کہ آپ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۶ء تک کے سارے ادب کو پڑھ جائیں اس بیس برس کے عرصے میں ادب

ہیں آپ کو سب کچھ ملے گا اگر نہیں ملے گا تو مذہب نہیں ملے گا۔ ہاں مذہب کی تحقیر ضرور ملے گی۔
پاکستان بننے کے بعد اگرچہ کچھ مذہب پسندوں اور کچھ اسلام پسندوں نے اس صورتحال کے خلاف آواز اٹھائی اور تحریک بھی چلائی مگر ان کا دائرہ اتنا محدود تھا کہ کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہیں آسکی۔ میں اس کو ابن صفی کا سب سے بڑا اعزاز سمجھتا ہوں کہ انہوں نے عوامی سطح پر سب سے پہلے اس مسئلے پر کاری ضرب لگائی اور ٹو یوڈ اسلسلے کے اپنی جاسوسی دنیا کے ناول میں نادر کا کردار پیش کر کے ساری ادبی جاسوسی دنیا کو چونکا دیا۔ نادر جو غنڈہ تھا بلکہ جرم کی جدید زبان میں گینگسٹر تھا اور کوئی برائی ایسی نہیں جس کے دھبے نادر کے دامن پر نہ ہوں وہ سرتاپا بدیوں کا مجسمہ تھا۔ مگر یہ نادر جب ایک دن سرور کائنات ختمی مرتبت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر طائف اور فتح مکہ کے واقعات اتفاقاً ایک دن سنتا ہے اور رسول پاکؐ کے اسوہ حسنہ سے آشنا ہوتا ہے تو نیکی کا وہ ٹھکرایا ہوا فراموش کردہ ریزہ جو اس کے دل میں چھپا ہوا تھا انگڑائی لے کر ایک دم جوان ہو جاتا ہے اور اسے سرتاپا تبدیل کر دیتا ہے۔ اب وہ برائیوں کی جگہ نیکیوں کا مجسمہ بن کر دنیا کے سامنے آتا ہے اور دنیا کی کوئی تخویف یا تحریص اسے استقامت کی راہ سے ہٹانے سے قاصر ہے۔ ابن صفی کے اس دھماکے نے جو بالکل غیر متوقع طور پر کسی ادب کی کتاب کے بجائے جاسوسی کے ایک ناول کے ذریعے سامنے آیا تھا اردو ادب کو ہلا کر رکھ دیا اگرچہ شروع شروع میں بہت مخالفت بھی ہوئی اور مذاق بھی اڑایا گیا مگر سچائی اور حقیقت اپنی جگہ خود بنا لیتی ہیں آج کے اردو ادب میں جو دین کا بول بالا ہے اور اسلامی ثقافت کا جو چرچا ہے اور شعری مجموعے جس طرح حمدوں سے مظہر اور نعتوں سے جگمگاتے رہتے ہیں سچ پوچھئے تو میں اسے ابن صفی کا ہی صدقہ جاریہ سمجھتا ہوں۔
ابھی بات ترقی پسند تحریک کی ہو رہی تھی۔ یہ فقط ایک ادبی تحریک ہی نہیں تھی بلکہ اس کے ڈانڈے ان زیر زمین تحریکوں سے ملے ہوئے تھے جن کے ذریعے سوویت یونین ایشیا' افریقہ اور وسطی امریکہ کے نو آزاد ملکوں کو اپنے حیطہ اقتدار میں لینے کے لیے کوشاں تھا (حوالے کے لیے پڑوسی ملک کی نکسل باڑی تحریک اور ۶۵ء کی انڈونیشیا کی بغاوت) لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا تھا اس نے اپنی ان کاوشوں پر سلطانی جمہور کا دلکش و پرفریب پردہ ڈال کر دنیا کی نگاہوں کو ایسا خیرہ کر رکھا تھا کہ کوئی بھی پس پردہ چھپی ہوئی سنگین اور تلخ حقیقتوں کو دیکھنے کے لیے تیار نہیں تھا جب تک کہ گردن میں پھندہ پڑ ہی نہ جائے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چین' کوریا' ویت نام' لاؤس' کمبوڈیا' کوسٹاریکا' ہانڈوراس' بولوویا' کیوبا' گھانا' موزمبیق اور ابی سینیا وغیرہ میں ہی کمیونسٹ اور سوشلسٹ حکومتیں ہی قائم نہیں ہوئیں بلکہ وہ ممالک بھی سرخ ہو گئے جن کا اور اسلام کا چولی دامن کا ساتھ تھا جیسے الجزائر' لیبیا' مصر' یمن' شام اور عراق وغیرہ یہ تو وہی بات ہوگئی کہ چوکفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی...... ہمارے اپنے پاکستان پر بھی جاننے والے

جانتے ہیں کہ ایک ایسا وقت آن پڑا تھا وہ تو کہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل کیا اور وہ وقت ٹل گیا ورنہ یار لوگوں نے سبز پاکستان کو سرخ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اس گھمبیر وقت کا سامنا کرنے میں بھی ابن صفی صف اول میں سینہ سپر تھے۔ انہوں نے پے در پے اپنے کئی ناولوں میں نہ صرف اس مسئلے کو اٹھایا بلکہ اپنی لاکھوں قارئین کے ذہنوں کو مدافعت کے لیے تیار بھی کیا انہوں نے نہ صرف مسئلے کی نشاندہی کی بلکہ ان ریشہ دوانیوں کا بھی بڑے چابکدستی سے پردہ فاش کیا جو سفارتی ہتھکنڈوں سے ثقافتی سرگرمیوں کے پردے میں کی جارہی تھیں یہاں میں آپ کی خدمت میں ابن صفی کی ایک دھماکہ خیز غزل پیش کر رہا ہوں جو شاید ان کے مجموعہ کلام میں شامل نہیں ہے کیونکہ وہ ان کی کتاب پاگلوں کی انجمن میں استاد محبوب نرالے عالم کی زبانی پیش کی گئی ہے۔ ذرا اس کی پر معنی طنز اور اس کی تشبیہوں اور استعاروں پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ ابن صفی کا سینہ کیسے دینی جوش سے پر تھا اور اپنے قلم کو ہتھیار بنا کر کس طرح انہوں نے اپنے عہد کی خوفناک زہرناکی کا مقابلہ کیا۔

اک دن جلال جبہ و دستار دیکھنا
ارباب مکر و فن کو سرِ دار دیکھنا
سنتے رہیں کسی بھی دریدہ دہن کی بات
ہم بھی کھلے تو جوششِ گفتار دیکھنا
قرآن میں ڈھونڈتے ہیں مساواتِ احمریں
یارو نیا یہ فتنۂ اغیار دیکھنا
در روز ہاں ہیں خیر سے آیات پاک بھی
ہے اہرمن یہ خرقۂ و پندار دیکھنا
کل تک جو بت کدے کی اڑاتا تھا دھجیاں
اس کے گلے میں حلقۂ زنار دیکھنا
ٹالی گئی ہے لال پری سبزہ زار پر
ہوتے ہیں کتنے لوگ گناہگار دیکھنا
فرصت ملے جو لال حویلی کے درس سے
اک بوریہ نشیں کے بھی افکار دیکھنا

ذکر استاد محبوب نرالے عالم کا آ گیا ہے تو دو چار باتیں ان کے بارے میں بھی سہی کیونکہ عام لوگ اور نئی نسل اور خصوصاً کراچی کے باہر کے لوگ استاد محبوب نرالے عالم کو محض ابن صفی کے ایک کردار ہی کی

حیثیت سے جانتے ہیں اور وہ استاد کو بھی من جملہ فریدی، حمید، عمران، سلیمان، جوزف، ظفر الملک اور جیمسن وغیرہ کی ایک کردار ہی سمجھتے ہیں۔ انہیں پتا ہی نہیں کہ استاد کیا قیامت چیز ہیں۔ دنیا کے اکثر بڑے لکھنے والوں کی جب تعریف کی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ ان کے کردار جیتے جاگتے نظر آتے ہیں مگر جب ان جیتے جاگتے کرداروں کا تجزیہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہیں مصنف کی مقصدیت نے تخلیق کیا ہے اگر چہ یہ بھی حقیقت ہے کہ فی الواقعی بہت سے ایسے کرداروں کے پیچھے کچھ جیتی جاگتی شخصیتیں بھی ہوتی ہیں جنہیں لکھنے والا اپنے مطلب کا پا کر منتخب کرتا ہے اور ان کا بغور معائنہ و مطالعہ کر کے اپنی مقصدیت کے پیش نظر ان پر اتنا چونا گارا لگا دیتا ہے کہ اصل خدوخال کا پہچان لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں اپنے ذاتی علم کے حوالے سے ابن صفی کے کئی دوستوں اور جاننے والوں کے بارے میں جانتا ہوں کہ وہ ابن صفی کے کس کردار کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں مگر وضاحت کے ساتھ انگلی رکھنا ممکن نہیں ہے خود ان کے ایک دو کرداروں پر بعض وقت مجھے خود اپنا گمان گزرا ہے لیکن یہ غالباً پوری دنیا کے ادب میں صرف ابن صفی کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے ایک پورا زندہ، جیتا جاگتا آدمی عادتوں، خصلتوں اور خوبوسمیت اپنا کردار بنا کر اپنے قلم کی نوک کے ذریعے اردو ادب کے سینے میں اتار دیا ہے اور اسے پیش کرتے ہوئے کسی طرح کی رنگ آمیزی کا ایک برش بھی اس کے چہرے پر نہیں لگایا ہے۔

ناظم آباد چورنگی پر واقع ابن صفی کا دفتر ایک ایسی بارگاہ تھی جہاں بیٹھ کر بڑی آسانی سے بھانت بھانت کا آدمی دیکھا جا سکتا تھا۔ وہاں اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھنے والے بھی آتے تھے اور ہم جیسے چھٹ بھیے بھی۔ ان آنے والوں میں ادب و شعر کے جغادری بھی ہوتے تھے اور وہ بے پڑھے لکھے رکشے والے بھی جو دوسروں سے پڑھوا کر ابن صفی کی کتابیں سن لیا کرتے تھے۔ ان میں وہ عالی ہمت بھی ہوتے تھے جنہوں نے محض ابن صفی کو خود پڑھنے کے شوق میں لکھنا پڑھنا سیکھا تھا۔ صرف ان لوگوں کے چہرے دیکھ کر اور ان لوگوں کی باتیں سن سن کر آدمی اگر چاہے تو بہت کچھ سیکھ سکتا تھا۔ کرداروں کے اس اجتماع ضدین کو دیکھ کر بعض اوقات ابن صفی پر بڑا ترس آنے لگتا تھا کہ اکثر جی نہ چاہنے کے باوجود اور خلاف طبیعت باتیں سن کر بھی اپنی طبیعت کی شرافت کے ہاتھوں انہیں ان لوگوں سے گفتگو کرنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ ان کی کتابیں طبیعت کی خرابی کے علاوہ اکثر اسی واسطے لیٹ ہوتی تھیں کہ کتاب لکھنے کا سارا وقت انہیں ملنے والوں کی نذر کر دینا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی وہ جھنجلا کر اس طرح کے ملاقاتیوں پر پابندی لگانے کے بارے میں سوچتے تھے مگر ان کی طبیعت کی ملنساری اور شرافت ہمیشہ اس طرح کے اقدام میں مانع رہی اور اگر وہ پابندی لگا بھی دیتے تو ہم جیسے بے تکلف ڈھیٹ لوگوں کا کیا کرتے۔

عام طور سے سن مجھے یاد نہیں رہتا اس لیے عموماً زمانہ یاد کرنے کے لیے میں مخدومی مشتاق احمد یوسفی

کے فارمولے پر عمل کرتا ہوں۔ یا تو ایوب خان کا آخری زمانہ تھا یا یحییٰ خان کا ابتدائی دور تھا۔ ایک دن سہ پہر کو ابن صفی کے دفتر پہنچا تو ایک عجیب و غریب شخصیت کو ان کے پاس براجمان دیکھا۔ گرمیوں کے دن تھے اور کراچی کی گرمیاں تو آپ جانتے ہیں کتنی پسینہ آور ہوتی ہیں مگر وہ صاحب سخت گرم موسم کے باوجود گرم پتلون اور گرم شیروانی میں ملبوس تھے' پیروں میں کھسہ تھا اور سر پر سولر ہیٹ تھا۔ پاس ہی ٹین کا بنا ہوا ایک بگل نما بھونپو بھی تھا۔ موصوف کا کلین شیو گہرا سانولا چہرہ پسینے سے چمک رہا تھا اور وہ کچھ عجیب استغراق کے عالم میں کرسی پر دھرے ہوئے تھے۔

یہ استاد محبوب نرالے عالم تھے اگرچہ ہم اس وقت تک ان کی ذات والا صفات سے واقف نہیں تھے مگر ابن صفی ان کو دریافت کر چکے تھے اسی لیے موصوف ان کے پاس ہی دھرے ہوئے تھے۔ ابن صفی کو ایسی نادر روزگار شخصیات دریافت کرنے میں ملکہ حاصل تھا۔ استاد محبوب نرالے عالم اپنی قسم کی واحد شخصیت اور بڑے بے دھڑک اور بے پناہ شاعر تھے' ادب میں بڑے بڑے اساتذہ گزرے ہیں مگر اتنا لمبا چوڑا تخلص آج تک کسی مائی کے لال کو نصیب نہیں ہوا۔ استاد کا فرمان تھا کہ وہ بڑے شاعر ہیں اسی لیے وہ تھے ورنہ اگر وہ کوئی اور فرمان جاری کر ڈالتے تو ان کا کیا کیا جا سکتا تھا۔ جوش اور جگر سے خود کو بڑا شاعر سمجھتے تھے بلکہ جوش صاحب سے تو خصوصی طور پر شاکی تھے کیونکہ استاد کا خیال تھا کہ جوش صاحب ان کے ذہن میں گھس کر اکثر ان تخلیقات کو اڑا لیا کرتے تھے جو ہنوز پردہ عدم سے استاد کے دماغ کے عرصۂ وجود پر نازل بھی نہیں ہو سکتی تھیں۔ حوالے کے لیے وہ جوش صاحب کی نظم گلبدنی کو پیش کیا کرتے تھے جو جوش صاحب نے استاد کے ذہن میں نقب لگا کر سرقہ کر لی تھی اگر جوش صاحب یہ نہ کرتے تو اب تک استاد کی ''قلبدنی'' مکمل ہو کر منصۂ شہود پر آ چکی ہوتی اور جوش صاحب ہی کیا بقول استاد یہ حرکت ان کے پیدا ہونے سے بہت پہلے غالب بھی ان کے ساتھ کر چکے تھے استاد شاعری میں انفرادیت کے قائل تھے اور اپنی انفرادیت کے ثبوت میں اپنے کلام کی بے وزنی کو پیش کرتے تھے۔ استاد کا کہا ہوا تقریباً ہر شعر بے وزن ہوتا تھا اب اس سے بڑھ کر استادی اور انفرادیت کا اور کون سا ثبوت ہو سکتا تھا۔ استاد میں یہ مرض بھی تھا کہ اکثر ان میں دوسرے بڑے شاعروں کی روح حلول کر جاتی تھی اور جب بھی ایسا ہوتا تھا تو ان ارواح کے فیض سے استاد کچھ باوزن شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ یعنی باوزن شعر کہنے میں قصور استاد کا نہیں بلکہ استادوں کی روحوں کا تھا جو زبردستی استاد کے جسم میں حلول کر کے انہیں مجبور کر دیا کرتی تھیں۔ اردو کے تمام بڑے اساتذہ کی طرح استاد بھی غم روزگار کا شکار تھے گویا یہ بھی ان کے استاد اور بڑے شاعر ہونے کی مزید دلیل تھی لیکن انہوں نے غم روزگار پر آہیں بھرنے شکوے کرنے یا تیرے میرے قصیدے کہہ کر پیٹ پالنے کے بجائے ایک عوامی دھندھا اپنا لیا تھا (یہ واقعی ان کی عظمت کی دلیل تھی مگر وہ خود اسے درخور اعتنا

نہیں سمجھتے تھے) ان کا یہ دھندھا "چنا جور گرم" بیچنا تھا جسے وہ "چنا کڑک" کہتے تھے۔ جب اندھیری راتوں میں بھونپو کو منہ سے لگا کر اپنی پاٹ دار آواز میں استاد چنا کڑک کی صدا لگاتے تھے تو دور دور سے شائقین کھچے چلے آتے تھے۔ استاد "محبوب نرالہ عالم" ہی نہیں تھے "محبوب خلائق" بھی تھے ان کی شاعری کے شائقین کی تعداد چنا خوروں سے بھی زیادہ تھی اس لیے استاد کو اکثر جو بھی عقیدت مند پا جاتا بری طرح دبوچ لیتا اور بعض اوقات تو ایسا ہوتا تھا کہ سننے سنانے کے چکر میں استاد ہفتوں دھندے سے دور رہتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسے موقعوں پر اکثر استاد کے قدرداں ان کے کام آتے تھے اور خود ابن صفی بھی استاد کے ایک بڑے قدرداں تھے۔ بعد میں استاد نے مزید ترقی کر ڈالی۔ سوندے سوندے چنے بیچنے چھوڑ دیئے۔ لمبی چوڑی سرسید ٹائپ ڈاڑھی رکھلی۔ پہلے نجومی بنے پھر عامل کامل اور آخر میں پیر بن گئے مگر وہ الگ قصہ ہے جو پھر کبھی سنایا جائے گا۔

بہر حال ابن صفی کے دفتر میں داخل ہوئے تو استاد کو وہاں براجمان پایا۔ اس وقت تک ہم ان سے واقف نہیں تھے' بس نام سن رکھا تھا۔ استاد کی وہاں موجودگی ہمیں کچھ اچھی نہیں لگی کیونکہ ہم تو ابن صفی کو اپنی تازہ غزل سنانے گئے تھے۔ ہم نے کرسی گھسیٹتے ہوئے ابن صفی سے اشارے سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ ہماری اس حرکت سے استاد کا استغراق ٹوٹ گیا انہوں نے اپنی چمکتی ہوئی سرخ سرخ آنکھوں سے ہمیں گھور کر دیکھا۔ ہم تعارف کے منتظر تھے مگر ہمیں جواب دینے کے بجائے ابن صفی ایک زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ استاد کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا۔

"کہیے کیا کچھ نزول ہو گیا استاد"

غالباً ہو ہچکچاہٹ ہمیں استاد کی موجودگی میں تازہ غزل سنانے کے بارے میں تھی وہی ہماری موجودگی میں استاد کو بھی لاحق تھی لہٰذا استاد نے پہلے تو ہم دونوں نیاز مندوں پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی پھر کچھ دیر اس طرح منہ اوپر اٹھائے رہے جیسے آسمان میں اڑتی ہوئی چیل دیکھنے کی کوشش کر رہے ہوں پھر تھوڑی دیر تک ناک بھوں پر زور دیتے رہے جو ان کی خاص ادا تھی پھر جھوم کر بڑی گرج دار آواز میں بولے۔

"سنیے صفی صاحب دیکھیے کیا چیز ہو گئی ہے
حسن کو آفتاب میں ضم ہو گیا ہے
عاشق کو ضرور بے خودی کا غم ہو گیا ہے۔

"جواب نہیں ہے استاد۔ کیا آفتاب میں ضم باندھا ہے کہ بالکل بند ھ کر رہ گیا ہے۔" ابن صفی نے داد دی۔ "ابھی یہ کیا چیز ہے" استاد انکساری سے بولے۔ "پچھلی رات اچانک مجھ میں غالب کی روح حلول کر گئی۔ بڑے بڑے سوال جواب ہوئے میں نے غالب کی روح کو للکار دیا اور صاف صاف کہہ

دیا کہ

تم بھلا باز آؤ گے غالب
راستے میں چڑھاؤ گے غالب
کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آئی......!

''مگر یہ تو وزن دار ہے استاد'' ابن صفی نے اعتراض کیا۔

''ارے صاحب میں نے کہا نہ کہ غالب کی روح حلول کر گئی تھی۔ میں کیا کرتا۔'' استاد نے بڑی بے نیازی سے وضاحت کی۔ اب معاملہ میری برداشت سے باہر ہو چلا تھا۔ مجھ سے نہیں رہا گیا اور میں نے ابن صفی سے پوچھ ہی لیا۔

''بھئی یہ کون صاحب ہیں؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ؟''

''ارے یار......تم انہیں نہیں جانتے'' میرے اشتیاق کو دیکھ کر ابن صفی نے سوکھا سا منہ بنا کر کہا۔

''نہیں بھائی......میں واقف نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''یہ ہیں امام الجاہلین قتیل ادب استاد محبوب نرالے عالم نہ غلہ'' ابن صفی نے تعارف کرایا اور پھر استاد کی طرف دیکھ کر بولے۔

''اور استاد یہ اپنے شاہد منصور ہیں۔ شاعری کرتے ہیں۔'' میں نے اس تعارف پر اور خصوصاً امام الجاہلین کے لقب پر بہت گھبرا کر استاد کی طرف دیکھا مگر استاد نے ابن صفی کے تعارف پر ذرہ برابر بھی توجہ نہیں دی تھی (بعد میں معلوم ہوا کہ وہ عبارت تو استاد کے وزٹنگ کارڈ پر بھی چھپی تھی) استاد نے مجھ سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور بولے۔

''تو آپ ہیں شاہد منصور......ایک دن آپ کو اردو بازار میں کرمانی بھائی کی دکان پر دیکھا تھا۔ ارے صاحب میں کیا اور میرا تعارف کیا میں تو ارتعاش سیمگاں کا دشت لامکاں میں مقیم مصلوب ہوں۔''

اس عجیب و غریب جملے کو سن کر مارے حیرت کے میرے منہ سے ''جی'' کے سوا اور کچھ نہیں نکل سکا۔ اگرچہ میں نہیں سمجھ سکا مگر ابن صفی سمجھ گئے تھے کیونکہ وہ استاد کے مزاج شناس ہی نہیں بلکہ ذہن شناس بھی تھے انہوں نے فوراً ہی استاد کی نگاہوں کا تعاقب کیا اور انکا ہدف تلاش کر لیا جو دو نوجوان لڑکیوں پر مشتمل تھا جو سامنے سے آ رہی تھیں۔ ابن صفی کو معلوم تھا کہ استاد پر ایسے نامانوس کڈھب بے معنی الفاظ بولنے کا دورہ اسی وقت پڑتا ہے جب آس پاس کوئی صنف مخالف محو خرام ہو۔ اتنے میں دونوں نوجوان خواتین ہاتھوں میں آٹو گراف بک سنبھالے دفتر میں داخل ہوئیں اور ابن صفی سے آٹو گراف کی خواستگار ہوئیں

جب تک وہ دفتر میں موجود رہیں ایسا لگا کہ استاد کی زبان اور نگاہ دونوں کو پالا مار گیا مگران کے جاتے ہی استاد نے ایک جھرجھری لی اور بڑی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ابن صفی کی طرف جھک کر بولے۔

"صفی صاحب' انسانی تہذیب کی جذباتی اور سکونی مناکحت بہت ضروری ہے۔ غالب وذوق وغیرہ نے بلکہ مومن نے بھی مشروباتی انجباریت کی تفصیل میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی مگر تجریدی ضابطے کی اشتراقیت مشروقی اطراب کی سند نہیں ہوسکتی۔"

اس جناتی جملے کو سن کر ابن صفی جھوم کر بولے۔

"واللہ استاد! آپ نے تو اپنی نثری گفتگو میں صفت مستول الجہاز پیدا کر دی ہے۔ بھئی بڑے لوگوں کی بڑی بڑی باتیں۔" پھر میری طرف مڑ کر بولے۔ "آپ کو معلوم ہے شاہد صاحب کہ استاد کا واسطہ کس عظیم خانوادے سے ہے؟"

صاف ظاہر ہے کہ میرے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا۔ میں نے بڑی مسکینی سے انکار میں سر ہلایا تو بولے۔

"بھئی دراصل استاد کا لکھنو کے سلطان واجد علی شاہ اختر اور دہلی کے شہنشاہ بہادر شاہ ظفر سے براہ راست نسبی تعلق ہے اسی لیے عنقریب استاد قیصر باغ لکھنو اور لال قلعہ دہلی کی ملکیت واگزار کرنے کے لیے بھارتی حکومت کو نوٹس دینے والے ہیں مگران کا حقیقی رشتہ مغلوں کے مورث اعلیٰ ڈفالخان سے ہے اگرچہ بیچ میں کہیں نادرشاہ درانی اور نوشیروان عادل بھی آجاتے ہیں۔"

بڑی حیرت سے میرے منہ سے نکلا۔ "ڈفالی"

اور استاد بڑی عجوب مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

"نہیں صاحب نہیں۔ وہ ڈفالی اور ہوتے ہیں۔ میرے مورث اعلیٰ ڈفال خان تھے جو فاتح عالم چنگیز خان کے دادازاد بھائی تھے اور انہیں کے بہنوئی کے نواسے کے ماموں کے داماد سکندر اعظم تھے۔"

میں سوائے سر ہلانے کے اور کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ کہا بھی کیا جاسکتا تھا مگر ابن صفی بھانپ گئے کہ میں کس بری طرح چھنٹ پڑنے کے لیے بے قرار ہوں لہٰذا انہوں نے فوراً ہی موضوع بدل دیا اور استاد سے وہ چٹنا کڑک سنانے کی فرمائش کی جسے سنا کر انہوں نے پی ای سی ایس ایچ سوسائٹی کے مکینوں بلکہ حسینوں کو لوٹ لیا تھا۔ استاد کو کیا عذر ہوسکتا تھا انہوں نے فوراً اپنا بھونپو اٹھایا اور پاٹ دار آواز میں شروع ہو گئے۔

"پی ای سی ایچ کے حسین
میرے چنے سے نمکین
بولے بھائی خیرالدین
پاپڑ ایک آنے کے تین

چنا کڑک"

سناتے سناتے اچانک استاد رک گئے۔ بھونپو ہاتھ سے رکھ دیا اور شیروانی کے دامن سے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر مجھ سے بولے۔

"شاہد صاحب یہ تو سیدھی سادی اردو ہے اس میں آپ کو کیا مزہ آیا ہوگا اگر کبھی آپ میری فارسا سنیں تو پھر آپ کو معلوم ہوگا کہ استاد کی شاعری کیا چیز ہے۔"

"فارسا" میری آنکھیں حیرت کے مارے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ابن صفی ہلکا سا کھنکارے۔"ارے بھئی حیرت کی کیا بات ہے۔ فارسا اور عربا تو استاد کے گھر کی لونڈیاں ہیں۔ اچھا بھئی عربا پھر کبھی سہی۔ استاد آپ شاہد صاحب کو فارسا ہی دیں یہ بھی کیا یاد کریں گے۔"

اور استاد تو جیسے منتظر ہی بیٹھے تھے۔ فوراً ہی کان پر ہاتھ رکھ کر شروع ہو گئے مگر شکر ہے اس مرتبہ انہوں نے بھونپو ہاتھ سے رکھ دیا تھا۔

"نظر خمی خمی، نظر گمی گمی، نظر سمی سمی
دھمک سنک فزوں فضا فرونی جیا لبم لبم
عشر خمو شگی خمر عشر فشاں نموز دم ردم
قلی دقل دلی دقل تحوقنی قنا قلم، قلم
نظر خمی خمی، نظر گمی گمی نظر سمی سمی"

پھر بارگاہ ابن صفی میں کچھ اور لوگ آ گئے۔ محفل کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ میں اٹھ کر گھر چلا آیا۔ پھر کئی مہینے گزر گئے۔ ابن صفی سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ استاد بھی اس درمیان ایک دو بار ملے مگر کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی پھر ابن صفی کی مشہور کتاب ڈاکٹر دعا گو چھپ کر آ گئی۔ اس کی قسطیں حریت اخبار میں چھپتی رہی تھیں مگر میں نے نہیں پڑھی تھیں لہٰذا جب کتاب ملی تو بڑے ذوق و شوق سے پڑھنا شروع کر دیا اور پھر میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب اس کتاب میں میں نے استاد محبوب نرالے عالم کو من و عن اسی طرح براجمان پایا جیسے وہ مجھے ابن صفی کے دفتر میں براجمان ملے تھے۔ اپنی تمام تر ہیئت کذائی، شکل و صورت، لباس اور بھونپو اور مکالموں کیساتھ کوئی بھی فرق تو نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ قدرت نے استاد کو ابن صفی کا کردار بننے کے لیے ہی پیدا کیا تھا۔

اب ایسا اور ڈھونڈھ کے لائیں کہاں سے ہم
ابن صفی کی بات تو اہل صفا کی تھی

(نئے افق اگست 93ء)

ابن صفی کا مشن، امن و انصاف کا فروغ

عمران عاکف خان

راجستھان

مذہبی کتابوں اور صحائف کے علاوہ بہت کم ایسی کتابیں اور دستاویز ہوتی ہیں جو انسان کو اچھے برے، صحیح غلط اور مناسب و غیر مناسب کی تمیز سکھاتی ہیں، انہیں ذمے دار اور معاملہ فہم بناتی ہیں، اسی طرح انہیں وقت، حالات، زمانے اور موسم کے تقاضوں سے آگاہ کرتی ہیں نہ صرف یہ بلکہ انہیں سکھاتی بھی ہیں اور تلقین بھی کرتی ہیں۔ جاسوسی دنیا اور ادب کے مایا ناز و قابل افتخار نام ابن صفی کا کوئی بھی ناول اٹھائیے اور پڑھیے، اس میں جہاں متعدد دلچسپ اور قابل غور باتیں ہوں گی وہیں نمایاں طور پر یہ دعوت اور فکر بھی ہوگی کہ ہم اپنے گرد و پیش کے حالات سے باخبر رہیں اور دنیا میں شر و فساد نہ برپا ہونے دیں۔ کھلے عام کسی کو بھی قانون اور انصاف سے کھلواڑ نہ کرنے دیں اور نہ ہی مجرمانہ امور کو فروغ پانے دیں۔ اسی طرح کسی کے ساتھ زیادتی نہ خود کریں اور نہ ہی کسی کو کرنے دیں۔ اللہ تعالیٰ کا جو نظام ہے اسے کائنات میں نافذ کرنے کی کوشش کریں اور دنیا کا امن و امان غارت کرنے والوں کے خلاف قانون کی مدد کر کے انہیں کیفر کردار تک پہنچائیں۔

ابن صفی کے قارئین ہر دور میں اس احساس سے مرصع رہے ہیں کہ انہیں ملک و ملت اور قوم پر آنے والے برے حالات میں کس طرح کے اقدام کرنے ہیں اور ان ناگفتہ بہ حالات سے کس طرح مقابلہ کرنا ہے نیز ان سے محفوظ رہنے کے کیا کیا طریقے ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابن صفی کے قارئین چاہے ان کا تعلق کسی بھی طبقے سے ہو وہ کسی کے بہکاوے میں نہیں آتے اور نہ ہی ملک و ملت کے سرمایوں کا سودا کرتے ہیں بلکہ بسا اوقات تو ان کا تحفظ کرتے کرتے جان تک دے دیتے ہیں۔ وہ اپنے ملک کے وفادار اور ملت کے بہی خواہ ہوتے ہیں۔ انہیں دنیا کی کوئی طاقت نہیں خرید سکتی اور نہ ہی ان کے "جذبہ حب وطن" کا سودا کر سکتی ہے۔ ملک و قوم کی صیانت و حفاظت کا فریضہ ادا کرنے میں انہیں ایسی خوشی اور مسرت محسوس ہوتی ہے جیسی قارون کا خزانہ ملنے پر بھی نہیں ہوتی۔ میری اس بات کی تائید کے لیے ابن صفی کے شاہ کار ناول "تابوت میں چیخ" کے کردار ظفر الملک کی مثال کافی ہوگی جو در بدری کی حالت میں ہونے کے باوجود جرائم سے نفرت کرتے ہوئے قانون کی حفاظت کرنے کا عہد کرتا ہے اور میوری و تھیلما کے چکر سے باہر آنے کے لیے تگ و دو کرتا ہے۔ جس میں وہ کامیاب بھی ہو جاتا ہے اور پھر عمران کی ٹیم کا ایک بہترین ممبر بن جاتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام اچھی صفات وہ ہیں جو انسان کو ازل سے ہی ملی ہوتی ہیں مگر وہ شیطان کے بہکاوے میں آ کر حقیقت سے روگردانی کر جاتا ہے مگر جب اسے کوئی یاد دلاتا ہے تو اس کو یہ سب باتیں یاد آ جاتی

ہیں۔ ابن صفی کے ناولوں نے بڑے پیمانے پر انسانوں کو ان کی متاع گمشدہ لوٹانے کا کام کیا اور ان کے مردہ ضمیروں میں عقابی روح پھونکی۔ یہی وجہ ہے کہ فریدی' عمران' صفدر' حمید' انور' رشیدہ ان کے کارنامے ہمیں اپنے کارنامے لگتے ہیں اور ان کو پڑھ کر ہمارے اندر یہ احساس پیدا ہونے لگتا ہے کہ ہم بھی خطرات سے کھیلتے ہوئے اور انسانیت دشمن عناصر سے لوہا لیتے ہوئے اسی طرح ظلم وناانصافی اور بدی کا خاتمہ کر سکتے ہیں نیز قانون کی عظمت واہمیت کو دوبالا کر سکتے ہیں۔ لوگوں کو قانون کا احترام کرنا اور ظلم سے متنفر ہونا سکھا سکتے ہیں۔ یقینی طور پر یہ بات بھی دلوں میں بیٹھ جاتی ہے کہ یہ کردار کہیں دور کوہ قاف سے نہیں آئے اور نہ ہی ان کا تعلق کسی ایسے سماج' طبقے اور خاندان سے ہے' جن کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اپنے ہی ہیں اور اپنے لہجے میں بات کرتے ہیں۔

جب نبیوں اور رسولوں سے ان کی امتوں نے سوال کیا...... "تم نبی کیسے ہو سکتے ہو جب کہ تم کھاتے پیتے ہو' شادی کرتے ہو' ہماری طرح بود و باش اختیار کرتے ہو' ہماری طرح بولتے اور بات کرتے ہو' نبی تو کوئی ایسا ہونا چاہیے جو فرشتہ ہو اور جس کا تعلق ہمارے گروہ سے نہ ہو......" اس کا جواب ان کو اس طرح دیا گیا:

"بے شک نبی تم میں سے ہے تا کہ وہ تمہاری زبان بولے اور تمہاری زبان میں تمہیں میرا پیغام پہنچائے۔ تمہیں اچھائیوں کی تلقین کرے اور برائیوں سے روکے۔ تمہارے سماج اور معاشرے میں اس کا رہنا اس لیے ہے تا کہ تم اسے اجنبی اور بیگانہ نہ سمجھو اور اس کی باتوں کو سمجھنے سے انکار کر دو۔"

ابن صفی کے ناولوں اور ان کے کرداروں کا ماجرا بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ زبان عوامی' انداز ہلکا پھلکا' اسلوب سلیس اور رواں' کردار ہمارے ہی سماج اور معاشرے کے' کھاتے پیتے' ضرورت مند' دشمنوں سے لڑائی اور مقابلے کے دوران زخمی ہوتے ہوئے اور جعل سازوں کے جعل میں پھنستے ہوئے' مجرموں کے ہتھے چڑھتے ہوئے' گاڑیاں' بندوق' پستول اور بم گولے چلاتے ہوئے' قانون کی عظمت اور شان پر قربان ہوتے ہوئے۔ کسی بھی طرح ان میں اجنبیت اور بیگانگت نہیں اور نہ ہی وہ دیومالائی نظر آتے ہیں۔ اپنے انسانی کرداروں کے ذریعے ابن صفی اپنے قارئین کو بتانا چاہتے ہیں کہ ہم میں سے ہر کوئی فریدی' عمران' حمید' صفدر' جولیا' ریکھا' خاور' نعمانی' جگدیش' رمیش اور ظفر الملک بن سکتا ہے۔ دلچسپ ترین بات تو یہ ہے کہ ان کے نام بھی ایسے ہیں جو ہمارے یہاں اکثر و بیشتر رکھے جاتے ہیں۔ ہما نگ وراہان' تھامو' بدرو' نیسن' ترانز' ڈیبناز وغیرہ جیسے نام نہ ہمارے معاشرے سے میل کھاتے ہیں اور نہ ہی انہیں کوئی اپنانا پسند کرتا ہے۔

بدلتے حالات سے آگاہ ہونے' سائنسی اور تکنیکی ایجادات سے لیس ہونے اور تعلیم و تدریس سے روشناس ہونے کی دعوت ابن صفی کے ہر ناول کا اہم ترین خاصہ ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ ناول انسانیت' انصاف' برابری' مساوات' حق و سچائی اور امانت و دیانت داری کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ بسا اوقات

فریدی اور عمران اپنے حریفوں پر قابو پالینے کے باوجود بھی شرافت و انسانیت کا دامن نہیں چھوڑتے، دشمن کو اتنی ہی سزا دیتے ہیں جس سے وہ رام اور بے بس ہو جائے اور پھر اسے عدالت کے حوالے کر کے دوسرے جرائم پیشہ عناصر کی سرکوبی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ان کے برخلاف حریف چاہتا ہے کہ اس کا بس چلے تو وہ نہ صرف فریدی، عمران بلکہ ان کے پورے شہر، نظام اور ملک کو کھنڈر بنا کر رکھ دے۔ نہ اسے دشمنوں کی تمیز ہوتی ہے اور نہ معصوموں کی جانوں کا خیال۔

اکثر لوگ سوال کرتے ہیں کہ آخر ابن صفی کے ناولوں کا مقصد کیا ہے نیز خود ناول نگار کا مشن کیا ہے؟ حالانکہ ابن صفی کے ناولوں میں خود اس سوال کا جواب موجود ہے تاہم جو ان کو پڑھتے ہی نہیں ان کی خدمت میں اتنا معروضہ پیش ہے کہ جس وقت پوری دنیا میں افراتفری، ہاہا کار اور بدامنی کا دور دورہ پھیلا ہوا ہے۔ نہتوں کو بے دریغ قتل و غارت کیا جا رہا ہے۔ بلا امتیاز عزت و عصمت پامال کی جا رہی ہیں اور بڑی طاقتیں چھوٹے ممالک کو غصب کر رہی ہیں۔ عالم یہ ہے کہ صبح کو جاگنے والا انسان شام کی عافیت کی یقین دہانی نہیں کرا سکتا اور رات کو سونے والے کو دیدنی صبح کا یقین نہیں ہے۔ ایسے حالات میں ابن صفی کا مشن ہمہ جہت اور ہر اعتبار سے امن و انصاف کا فروغ ہے۔ وہ چاہتے ہیں انسانیت پھر سے اپنے جامے میں آ جائے اور پھر سے دنیا امن و آشتی و محبت و اخوت کا گہوارہ بن جائے۔ ان کی کوشش ہے کہ ابنائے آدم پھر سے اس سبق کو پڑھ لیں جس کی انہیں حق جل مجدہ کی جانب سے تلقین ہوئی تھی۔ وہ انسانیت کا تحفظ اور ان کی زندگی کی ضمانت چاہتے ہیں۔ اسی طرح وہ اپنی اخلاقی اور ادبی ذمے داری سمجھتے ہوئے پوری دنیا کو ان خطرات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں جو ان کی ہستی اور وجود کو مٹانے کو بے تاب ہیں۔ یہ وہ خو ہے جو بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔

اردو کے مقبول عام ناول نگاروں میں تنہا ابن صفی ہی اس مشن کے مبلغ نظر آتے ہیں حالانکہ یہ ہر قلم کار کا قلمی، علمی اور ادبی فرضہ ہے۔ پھر بجائے اس کے کہ ابن صفی کے اس مشن کی تائید کی جاتی اور اسے سراہا جاتا ایسا نہ ہو سکا۔ جس کا ہر اس انصاف پسند کو ملال ہے، جو دنیا میں اچھائیوں کا طالب ہے اور بگڑتی صورت حال اسے خون کے آنسو رلا دیتی ہے۔

تقریباً ۲۸ سال ابن صفی اپنے اس مشن پر گامزن رہے اور کبھی کسی سے اس کی اجرت طلب نہ کی۔ جس طرح انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام زندگی بھر اپنی امتوں کو عذاب الٰہی سے ڈراتے اور متبعین کو بشارتیں سناتے رہے اور اپنی امت سے کبھی کوئی اجر طلب نہیں کیا۔ انہیں دعا دیتے دیتے مولائے حقیقی سے جا ملے۔ یہی انداز تھا ابن صفی کا اور یہی ان کا مدعا تھا کہ

اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب بندہ ناشاد

ہاں! بہت کم لوگوں نے یہ فریاد سنی اور وہ ظفریاب ہو گئے۔

شکستِ طلسم

شاہد منصور

خود ابن صفی کا قول ہے اور بڑا سچا قول ہے کہ آدمی گنجینۂ خیالات ہے۔ ذرا اس قول پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ راہوارِ تخیل کہاں کہاں کی سیر کراتا ہے۔ آدمی اور حیوان میں جو فرق ہے ان میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ آدمی خیال کی جولان گاہ سے بہرہ ور ہے اور حیوان اس سے محروم ہے۔ آدمی کی ساری ترقیاں بھی خیال ہی کی مرہونِ منت ہیں۔ اگر آدمی خیال کی بلند پروازی سے محروم ہوتا تو وہ آج حیوانوں کی طرح ہی غار نشین ہوتا اور جنگلوں میں دیگر جانوروں کی طرح اپنی زندگی کے دن گزارتا۔ ضرورت نے آدمی کے خیال کو وسعت دی اور وسعتِ خیال کو عملی جامہ پہنا کر آدمی ارتقاء کی منزلیں طے کرتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس بیسوی صدی میں آدمی نے زمین کی حدیں بھی توڑ دیں اور چاند ستاروں کو اپنی گزرگاہ بنالیا لیکن یہ آدمی کی آخری حد نہیں۔ خیال کی جلوہ گری سلامت رہے تو دیکھیے کہ آنے والی صدیوں میں آدمی کائنات کی کن کن سرحدوں کو پامال کرنے کا شرف حاصل کرتا ہے اور کون کون سے نئے عجوبے وجود میں لاتا ہے۔

اس ساری تمہید کی ضرورت یوں پیش آئی کہ......؟ مشتاق احمد قریشی صاحب کی عنایت سے ابن صفی کی نظم ''شکستِ طلسم'' ہاتھ لگ گئی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس طلسم کی سیر آپ کو بھی کرادوں۔ ابن صفی اگرچہ دنیائے شاعری میں ''اسرار ناروی'' کے نام سے متعارف تھے مگر ان کی ذات کی پہچان کے لیے ''ابن صفی'' کا نام اتنا مشہور ہو چکا ہے کہ بلا کسی معذرت' میں مضمون میں یہی نام استعمال کروں گا کیونکہ اسی نام میں ان کے سارے نام سما چکے ہیں اور اب الگ سے اسرار ناروی' عکاس' سنکی سولجر اور طغرل فرقان وغیرہ کا تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے بقول شیکسپیئر'' گلاب کے پھول کو چاہے جس نام سے پکارو' وہ گلاب کا پھول ہی رہتا ہے''

ابن صفی سے جن لوگوں کو ملنے کا اتفاق ہوا ہے انہیں دو طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک طبقہ ان لوگوں کا ہے جنہوں نے یا تو ابن صفی کا دور سے دیدار کیا یا محض ایک ملاقات ہی کو اپنی عقیدت و محبت کی معراج سمجھا۔ ایسے لوگوں کے خیال میں ابن صفی بہت متین' سنجیدہ' کم گو اور خشک طبیعت کے مالک تھے' بہت کم بولتے تھے' زیادہ تر مخاطب ہی کو بولنے کا موقع دیتے تھے۔ خود عام طور سے ''ہاں' ہوں' بہت اچھا' ٹھیک ہے'' سے ہی کام چلا لیتے تھے۔ اس طبقے کا خیال کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔ جب آپ کسی شریف آدمی کے سامنے بیٹھ کر' اس کے منہ پر' اس کی تعریفوں کے پل باندھیں گے اور اپنی عقیدتوں کا اظہار

کریں گے تو وہ بے چارکیا بول سکے گا......! اس کا گلا تو اپنی تعریفیں سن سن کر خود ہی بند ہو جائے گا لیکن وہ لوگ جنہیں ابن صفی کا ہم پیالہ و ہم نوالہ ہونے کا شرف حاصل ہو چکا ہے وہ جانتے ہیں کہ ابن صفی کس باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی طبیعت کی براقی کے سامنے بڑے بڑے فقرے بازوں کے منہ بند ہو جاتے تھے۔ بات سے بات پیدا کرنا اور بات کو زمین و زماں کی سرحدوں تک پھیلا دینا' ان کی طبیعت کا ادنیٰ کمال تھا۔ دل پر غموں کا کیسا ہجوم ہو مگر ان کی مجلس سے آدمی ہمیشہ خوش و خرم ہی اٹھتا تھا۔ سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع بھی ان کی بارگاہ میں مسکراہٹوں کی پھلجھڑی بن جاتا تھا اور ان کی طبیعت کا یہی وہ رخ ہے جس نے سراغ نگاری جیسے خشک موضوع کو ایسا شاداب بنا دیا کہ بڑے بڑی ثقہ حضرات کے تکیوں کے نیچے سے عمران سیریز اور جاسوسی دنیا کے شمارے نکلنے لگے۔

شاعری بڑا نازک فن ہے۔ یہاں لفظوں کو بہت سنبھال کر اور تول کر استعمال کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک ایسا پل صراط ہے کہ آدمی ذرا چوکا اور اعتدال سے ہٹا اور اس کی غزل' ہزل اور نظم پھکڑ پن کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ لمحے بھر میں لفظوں کی آبرو اتر جاتی ہے لیکن جن لوگوں نے بھی اس نازک سے فرق کو اپنی پوری فکری صلاحیتوں کے ساتھ استعمال کیا ہے' انہوں نے اسے طنز کے ایسے خاردار نوکیلے نشتر میں تبدیل کر دیا ہے جو براہ راست رگ جاں سے پیوست ہو جاتے ہیں۔ غالب کے ایسے نوکیلے نشتروں کو کون فراموش کر سکتا ہے۔

آدمی جب ایک سے زیادہ صلاحیتوں کا مالک ہو تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کا ایک رخ وسعت حاصل کر کے اس کے باقی رخوں کو اس طرح دبا دیتا ہے کہ دیکھنے والوں کے سامنے اس کی ایک رخی تصویر ہی سامنے آتی ہے۔ ابن صفی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ سراغ نگاری نے ان کی شاعری کو کچھ اس طرح دبا دیا ہے کہ لوگوں کو بتانا پڑتا ہے کہ ابن صفی شاعر بھی تھے اور بڑے قیامت کے شاعر تھے۔ اس غفلت اور لاعلمی میں لوگوں کا قصور بھی نہیں ہے دراصل ان کی سراغ نگاری کی تصنیفات جس تسلسل اور تواتر کے ساتھ سامنے آتی رہیں' اس طرح ان کی شاعری سامنے نہیں آ سکی اور یوں لوگ ابن صفی کی شاعرانہ عظمت سے واقف نہیں ہو سکے۔ اس میں کچھ مرحوم کی طبیعت کی تساہلی کا بھی دخل ہے۔ مشاعرے باز وہ زندگی میں کبھی نہیں رہے' جس کی وجہ سے عام لوگ ان کا کلام ان کی زبانی سننے کا شرف کبھی حاصل کر ہی نہیں سکے۔ اب جہاں تک بذریعہ طباعت روشناس خلق ہونے کا تعلق ہے' تو اس کی بھی صورتحال یہ ہے کہ یا تو مرحوم کا کچھ کلام بالکل ابتدائی زمانے میں ماہنامہ نکہت وغیرہ میں چھپا تھا یا پھر کچھ کلام زندگی کے آخری زمانے میں میں ''صفحہ دل'' کی صورت میں نئے افق کے ذریعے سامنے آیا۔ درمیانی عرصے میں جو خاصا طویل ہے' مرحوم کی کوئی نگارش لوگوں کے سامنے نہیں آ سکی اور کچھ

نامعلوم وجوہات کی بنا پر بدقسمتی سے ان کا مجموعہ کلام بھی تاحال شائع نہیں ہوسکا اور یوں عام آدمی اب تک ابن صفی کی شاعرانہ' فنکارانہ اور اخلاقانہ شخصیت کے تعارف سے محروم ہے۔ میری مرحوم کے فرزندوں عزیزان ایثار' ابرار' احمد' افتخار اور مرحوم کے فرزند معنوی عزیزم مشتاق سے درخواست ہے کہ ان کے مجموعہ کلام کی اشاعت کی طرف خصوصی توجہ کریں۔ (اب شائع ہو چکا ہے)

میں نے ابن صفی کی طبیعت کے جس طنازانہ پہلو کا ذکر کیا ہے اس کا شاہکار' ان کی یہ نظم'' شکست طلسم '' ہے جو اس مضمون کی وجہ بنیاد ہے۔ اس نظم میں ان کی طبیعت کا یہ رخ اپنی انتہائی بلندی تک پھیلا ہوا ہے۔ ایک عجیب بات ہے کہ اردو شاعری میں جہاں بھی طنز استعمال ہوا ہے' وہاں اس کی زہرناکی پوری شدت سے ابھر کر سامنے آ جاتی ہے مگر یہ کیسی خوش گوار حقیقت ہے کہ شکست طلسم میں طنز تو اپنی پوری توانائیوں اور گہرائیوں کے ساتھ موجود ہے..... مگر زہرناکی کے عنصر سے محروم ہے۔ اس کی جگہ پوری نظم کا شگفتہ نشاطیہ لہجہ قاری کو ایسی سرسبز و شاداب وادی میں لے جاتا ہے جو عالم امکان کی ایک بالکل نئی تفسیر ہے۔ یہ لہجہ اردو شاعری میں بالکل نیا لہجہ ہے۔ کاش یہ لہجہ عام ہو جائے تو زندگی کی کلفتوں اور یبوستوں میں کچھ تو کمی آئے۔

ابن صفی کی نظم شکست طلسم زندگی کی دو انتہاؤں کی جھلکیاں ہمیں دکھاتی ہے۔ عشق و محبت انسانی زندگی کا قدیم ترین موضوع ہے اور آدم سے ایں دم تک شاعری میں لاکھوں زاویوں سے اس کی ترجمانی کی گئی ہے اور کی جاتی رہے گی۔ آدمی جب عشق کرتا ہے تو اپنے محبوب کو اپنے خیال میں' ایک ماورائی دنیا کی ایسی اعلیٰ و ارفع مسند پر بٹھا دیتا ہے جہاں دیوی بنا کر پوجنے کے علاوہ جذبات کے اظہار کی کوئی اور صورت باقی نہیں رہتی مگر جب اسی شبنم' ریشم اور کرنوں سے بنی ہوئی محبوبہ کی شادی ہو جاتی ہے اور وہ دیوی بنا کر پوجنے والے کے گھر میں بیوی کی حیثیت سے براجمان ہوتی ہے تو چند ہی دنوں میں محبوبہ پر سے دیوی کا ملمع اتر جاتا ہے اور وہ خالص بیوی کی شکل میں اس طرح نمودار ہوتی ہے کہ عاشق کے ذوق عبودیت کا سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے اور وہ بے اختیار سوچتا ہے کہ میں کہاں پھنس گیا۔ آئیے دیکھتے ہیں کہ ابن صفی نے زندگی کی ان دونوں انتہاؤں کو کس خوبصورتی اور فن کارانہ صلاحیت سے شکست طلسم میں پیش کیا ہے۔

شکست طلسم' اقبال کے آفاقی مصرعے'' تراشیدہ' پرسیدم' شکستم ' کی منہ بولتی تفسیر ہے۔ یہ نظم دو حصوں پر مشتمل ہے پہلا حصہ محبوبہ کے بارے میں عاشق کے دلی تاثرات' اس کے ذوق عبودیت اور محبوبہ کے ریشم و شبنم سے بنے ہوئے سراپا کی عکاسی کرتا ہے۔ اس حصے کو ہم بلا تکلف اردو شاعری کے خوبصورت ترین حصوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ دیکھیے' شکست طلسم' کیسے منہ بولتے ہوئے مصرعے سے

شروع ہوتی ہے۔

"اے طلسم خیال کون آیا!"

بظاہر ایک مصرع ہے مگر کتنے جہان معانی اس میں پوشیدہ ہیں' کائنات کی ابتدا ہے' مادم کن کی صدا آ رہی ہے' ہستی کی نگار آتشیں رخ کے چہرے سے نیستی کی نقاب ہٹنے والی ہے...... امکانات کے در وا ہو رہے ہیں۔ نیا آدم اپنی حوا کے انتظار میں ہے۔ آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوتی ہیں اور وہ محبوب سامنے آتا ہے جو ستاروں کی دمک' شبنم کی چمک' ہواؤں کی نرمی' سبزہ وگل کے رنگ کے خمیر سے تیار کیا گیا ہے۔ آیئے' ذرا اس کے سراپا پر نظر ڈالیے۔

"کرشمہ دامن دل می کشد کہ ایں جا ہست"

وہی بوٹا سا قد' وہی رفتار
وہی الھڑ پن' وہی گفتار
کپکپاتے ہوئے لبوں پہ ہنسی
ہنستے ہنستے کلام زیر لبی!
موتیوں کی قطار زیب گلو
پیرہن کی عجیب سی خوشبو
عارضوں پر وہ بالیوں کا رچاؤ
کتنا دلکش ہے ابروؤں کا تناؤ
شوخ سی ایک لٹ ہے ماتھے پر
پارۂ ابر جیسے وقت سحر
پیرہن جیسے لہلہائے چمن
بھیرویں کی الاپ ہے کہ بدن
وہ ہنسی اور وہ جسم کی ہلچل
جیسے لہروں میں ڈوبتا ہو کنول

نظم کا دوسرا حصہ' اس مصرعے سے شروع ہوتا ہے

"آخرش ٹوٹ ہی گیا وہ طلسم"

ملاحظہ فرمایا آپ نے' کتنا کرب ہے اس مصرعے میں۔ کائنات لٹ چکی ہے' ازل تا ابد ایک بیکراں خلا ہے' چاروں طرف گھمبیر سناٹا چھایا ہوا ہے' خواب ٹوٹ چکے ہیں' دیوی اپنے سنگھاسن سے

نیچے اتر آئی ہے' محبوبہ بیوی بن چکی ہے اور اپنے پورے بیویانہ اختیارات کو بروئے کار لارہی ہے جو عاشق کے خواب وگمان میں بھی نہ تھے۔ آیئے' دیکھتے ہیں کہ دیوی' بیوی بن کر کن مشغلوں میں مصروف ہے۔

نہ وہ الھڑ پنا' نہ وہ گفتار
کل سے خالہ کو ہوگیا ہے بُخار
میں نے ڈالا تھا' مولیوں کا اچار
جس میں بالکل نہیں ہے تیل کی جھار
جانے کیا یہ تیل ہوتا ہے
جانے کس شے کا میل ہوتا ہے
پیلی سرسوں کا اب نصیب کہاں

دیکھا آپ نے عاشق کے جذبات واحساسات کا طلسم کس بری طرح ٹوٹا ہے اور ریشم وشبنم سے بنی ہوئی محبوبہ' بیوی بن کر کیسے خالص انسانی جذبوں سے خالہ کے بخار اور مولیوں کے اچار میں دلچسپی لے رہی ہے۔ اسے اپنے دیوی بننے اور پوجے جانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ تو انسان ہے اور انسان ہی رہنا چاہتی ہے۔ مگر فن کار عاشق اس کے اس روپ کو قبول کرنے کے لیے ذہنی طور پر اب بھی تیار نہیں۔ وہ اپنے ذوق عبودیت کو تسکین دینے کے لیے اسے دوبارہ دیوی کے سنگھاسن پر بٹھانا چاہتا ہے مگر محبوبہ کو بیوی بننے کے بعد پھر سے دیوی بننا قبول نہیں۔ دیکھیے وہ اپنے ردعمل کا اظہار کیسے بھرپور طریقے سے کرتی ہے اور عاشق کے ذوق عبودیت کو آئینہ دکھاتی ہے۔

اب کہاں وہ کلام زہریلی
گالیوں پر ہے پیار کی ٹھہری
تم بہت تھڑدلے ہو' احمق ہو
کان نہیں دھرتے جو بات کرو
جانے ہو کس قماش کے بندے
آدمی بھی ہو یا نرے رندے
بات کرتے ہو احمقوں کی سی
چال چلتے ہو بطخوں کی سی

محبوبہ کا خیال تھا کہ اس کے لہجے کی تلخی' عاشق شوہر نما کو اس کے خیالات کے خول سے باہر لے آئے

گی اور وہ بھی نرے عاشق کے بجائے آدمی بننے پر آمادہ ہو جائے گا مگر ہر آرزو تو پوری نہیں ہوتی۔

مرد ناداں پر کلام نرم نازک بے اثر ہوتے دیکھ کر بیوی کا لہجہ آتش اور آہن کا لہجہ بننے لگتا ہے۔ وہ انتہائی جلال کے عالم میں جل کر عاشق کو آئینہ دکھاتی ہے۔ اردو شاعری میں محبوبہ کے سراپے تو بہت لکھے گئے ہیں مگر یہاں مردانہ سراپا پیش کیا گیا ہے جو پوری شاعری میں بالکل نئی چیز ہے۔

بات کرتے ہو احمقوں کی سی
چال چلتے ہو بطخوں کی سی
بال کب سے نہیں ترشوائے
کوئی کہہ کہہ کے دانت منجوائے
کیوں نظر آؤ اس طرح مجنون
گر پریس کر لیا کرو پتلون
بولنے پر جو آؤ' چاٹو کان
اور خموشی دکھائی دے خفقان

یہ لہجہ اور یہ سراپا عاشق کی برداشت سے باہر ہے۔ وہ اپنی فن کارانہ اور شاعرانہ عظمت کا حوالہ دے کر بیوی کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر حسینہ دمشق نے شیخ سعدیؒ کی اور امراؤ بیگم نے مرزا اسد اللہ خان غالب کی شاعرانہ عظمت کب تسلیم کی تھی' جو یہ بیوی تسلیم کر لیتی اس کا فوری ردعمل ملاحظہ ہو۔

اپنے فن پر بہت نہ اتراؤ
آدمی بن کے بھی تو دکھلاؤ!
فن کو میں سر کی جوں سمجھتی ہوں
کیسے برداشت تم کو اب میں کروں

کاش! ابن صفی اتنی جلدی ہم سے رخصت نہ ہوتے تو جانے کتنی خوبصورت نظمیں اور اردو ادب کی زینت بن چکی ہوتیں۔

(نیا رخ دسمبر 1988ء)

شیر کا شکار

ابن صفی

ہانکا کرنے والوں کا شور بہت دور سے سنائی دے رہا تھا میں شیر کا منتظر رہا گھڑی میں سے ایک پستول کھینچ کر سامنے رکھ لی تھی پاڑ تالاب کے کنارے کھڑا اطمینان سے جگالی کر رہا تھا۔

کچھ دیر دور سے شیر کے دھاڑنے کی آواز آئی میں نے رائفل ہاتھ سے رکھ کر پستول سنبھال لی۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ شیر بھی آ گیا بڑی شان سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا تالاب کی طرف آ رہا تھا پستول بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ پڑی پاڑے کی بری حالت تھی دفعتاً شیر نے ہلکے سے قہقہے کے ساتھ اس سے کہا۔

"برخوردار پریشان ہونے کی ضرورت نہیں میں لنچ کر چکا ہوں شکاری صاحب چغد معلوم ہوتے ہیں تمہیں خوانخواہ تکلیف دی۔" اپنے لیے لفظ "چغد" سن کر میں غصے سے پاگل ہو گیا اور یہ بھی بھول گیا کہ کچھ دیر پہلے بے حد خائف تھا۔

میں نے اپنا سینہ ٹھونک کر کہا "میں ادیب ہوں۔"

پھر میں نے محسوس کیا کہ شیر میری طرف مڑ کر حقارت سے مسکرایا ہے، اس نے کہا۔ "تب تو تم چغد سے بھی سینئر ہو، یعنی الو۔" میں نے رائفل سنبھالتے ہوئے اسے للکارا۔ "زبان سنبھال کر بات کر۔" وہ جھینے لگا دیر تک ہنستا رہا پھر بولا۔ "رکھ دو رائفل رکھ دو کیوں ایک گولی ضائع کرو گے ٹرانزسٹر ریڈیو سیٹ ہو تو نکالو میں ابھی تمہارے سامنے یہیں دم توڑ دوں گا۔"

"کیا بکواس ہے۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"یقین کرو میرے دوست۔" وہ بے حد سنجیدہ ہو کر گلوگیر آواز میں بولا۔

"کلام اقبال کی قوالی سن کر میں زندہ نہیں بچوں گا دراصل خودکشی ہی کی نیت سے میں بستی والوں کے ٹرانزسٹر اٹھا لایا ہوں، ایک دن اتفاق سے اسی وقت میں نے ریڈیو کھولا کہیں سے کلام اقبال کی قوالی ہو رہی تھی میری حالت بگڑنے لگی بس مرنے ہی والا تھا کہ کمبخت بیٹریاں ایگزاسٹ ہو گئیں، ریڈیو بند ہو گیا اور میں مر نہ سکا۔

آدمی تو کیا اس ملک کے جانوروں کو بھی زندہ رہنے کا حق حاصل نہیں جہاں اقبال جیسا عظیم المرتبت شاعر قوالوں کے حوالے کر دیا گیا ہو، کیا بتاؤں دل کی کیا حالت ہوتی ہے جب اس ملکوتی کلام پر بے ہنگم اور بھدی موسیقی کے بغدے چلتے ہیں آخر اس عظیم شاعر کو کس گناہ کی پاداش میں قوالوں کے حوالے کر دیا

گیا ہے قیام پاکستان سے قبل تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا شاید نظریہ پاکستان پیش کرنے کی سزا ہے۔
پھر وہ شیر دفعتاً نظروں سے اوجھل ہو گیا اور میرے کانوں سے ڈھولک اور ہارمونیم کا شور ٹکرانے لگا کچھ ایسی اذیت کہ بے ساختہ اچھل پڑا آنکھیں مل کر دیکھا تو ایڈیٹر صاحب سامنے بیٹھے ہوئے جھومتے نظر آئے ریڈیو پوری آواز سے کھلا ہوا تھا اور شب جمعہ ہونے کی وجہ سے قوالی جاری تھی قوال صاحب فرما رہے تھے۔

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا نہ کرے
کہ میرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

سچ کہتا ہوں میرا بھی یہی جی چاہا کہ خودکشی کر لو اب یہاں تک نوبت پہنچ چکی ہے کہ قوال حضرات کلام اقبال پر اصلاح فرمانے لگے میں نے ریڈیو کی طرف ہاتھ اٹھا کر ایڈیٹر صاحب سے پوچھا۔ "یہ کیا بک رہا ہے۔"
جھومتے ہوئے بولے۔ "پتا نہیں ویسے میں پسند نہیں کرتا کہ میرے دفتر میں کام کرنے والا کوئی آدمی کرسی پر ہی سونا شروع کر دے۔"
"میں پوچھ رہا ہوں کہ یہ صحیح شعر پڑھ رہا ہے۔" میں نے غصیلی آواز میں پوچھا۔
"مجھے شعر و شاعری میں کوئی دلچسپی نہیں تم میری بات کا جواب دو۔"
"دیتا ہوں جواب۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا ہاتھ بڑھا کر ایڈیٹر صاحب کا گریبان پکڑ لیا اور ایک ہی جھٹکے میں وہ بھی اٹھتے چلے آئے اب ان کی گردن میری گرفت میں تھی اور میں دانت بھینچے کہہ رہا تھا۔
"شیر کے شکاروں سے پہلے تم جیسے مٹی کے شیروں کا شکار ہونا چاہیے جو ادب کے سچے خادم بھی ہیں اور جنہیں کلام اقبال کی قوالی پر حال بھی آتا ہے۔"
وہ غل مچاتے رہے لیکن میں نے انہیں اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک کہ ان کا دم نہیں نکل گیا۔

ادب کے تقاضے اور ابن صفی

(۱)

یعقوب یاور

ابن صفی کے ناولوں میں ادبی جمالیات کی تلاش یا نثری ادب کے تقاضوں کی روشنی میں ابن صفی کے ناولوں پر گفتگو سے قبل کچھ باتوں کا ذہن میں تازہ اور صاف کر لینا ضروری ہے۔ اس لیے نہیں کہ یہاں کھینچ تان کر ابن صفی کی تحریروں کو ادبیات کی قلم رو میں داخل کرنے کی کوشش کرنی ہے بلکہ محض اس لیے کہ اردو کے ادبی ماحول میں ان کے عالم ادب کی حدود سے باہر ہونے کے بارے میں غیر ذمہ دارانہ طور پر پھیلا دی جانے والی بے بنیاد افواہیں گردش میں ہیں اور بدقسمتی سے یہ ہمارے دلوں میں اتنی گہرائی تک پیوست ہو چکی ہیں کہ ہم کسی نئی بات کو خواہ وہ صداقت پر ہی مبنی کیوں نہ ہو، قبول کرنے کے لیے مشکل سے تیار ہو پائیں گے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ابن صفی کے ناول اظہار کی اپنی جمالیات کی بنیاد پر پہلے ہی سے ادبی تحریریں ہیں جنہیں ادب کے نام نہاد ٹھیکیداروں نے بہ جبر اس قلم رو میں داخل ہونے سے روک رکھا تھا۔ ذہن کی اس تازہ کاری کے بعد شاید یہ ممکن ہو پائے گا کہ ہم ابن صفی کی تحریروں کے تعلق سے سابقہ تعصبات سے بالاتر ہو کر دیانت داری کے ساتھ ان باتوں کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر سکیں گے جہاں ماضی کی ہماری تنقید نہیں پہنچ سکی ہے۔

اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ ادب کے بارے میں، بالخصوص نثری ادب کے تعلق سے ماضی میں ہمارے ناقدین کا ذہن صاف نہیں رہا ہے۔ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے، ہمارے ناقدین عملی سطح پر علوم و فنون کے مابین امتیاز و تفریق بھی روا نہیں رکھ پائے ہیں۔ ہمارے خلط ملط تنقیدی ذخائر میں ایک طرف علم کو فن اور فن کو علم اور دوسری طرف ادب کو غیر ادب اور غیر ادب کو ادب تصور کر کے فیصلے صادر کرنے کا مزاج عام طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے پس پشت اسباب و علل کی جو دنیا آباد ہے اس میں ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ ہمارے یہاں نثری ادب کے قواعد و ضوابط کا تعین نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے ناقدین خود ہی اس بات کو لے کر مذبذب (Confused) ہیں کہ کس تحریر کو ادب کہنا چاہیے اور کسے ادب نہیں کہا جا سکتا۔ شاید اسی لیے ماضی کا تقریباً ہر ناقد اپنے طور پر ادب کی تعریف وضع کرتا نظر آتا ہے اور اپنی ذاتی پسند اور ناپسند کو بنیاد بنا کر یا زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھتے ہوئے جس نثر پارے کو چاہتا ہے ادب کہہ دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے رد کر دیتا ہے۔ اس کی بات کا درست یا نادرست ہونا منطق و ذہانت پر نہیں اتفاق پر مبنی ہوتا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ماضی میں ہانگ کانگ کی حسینہ اور اس جیسے متعدد ناولوں میں ادبی جمالیات سے یکسر روگردانی کے باوجود ان کے تخلیق کاروں کو ادبی فنکار سمجھا گیا ہے اور ادب میں معاشرے کی ممنوعہ دنیاؤں کی بازیافت کرنے

والے منٹو اور ان جیسے کچھ اور فنکاروں کو قصوروار ٹھہرا کر ادب کی قلم رو سے باہر کر دیا گیا۔ ایسا شاید اس لیے ہوتا تھا کہ کچھ مصلحت گرفتہ لوگ ناقدین عصر سے ذاتی روابط استوار رکھتے تھے اور کچھ انھیں خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ یہی نہیں اس رویے کے طفیل ہمارے تنقیدی ذخائر میں ایک ہی شخص یا فن پارے کے بارے میں متضاد آرا کا ایک انبار جمع ہوتا چلا گیا ہے اور یہ سلسلہ یہاں تک جا پہنچا ہے کہ ادب کی تنقید و تحقیق اور تاریخ و سوانح جیسے خالص علمی کاموں کو بھی ادبی یا فنی کارناموں میں شمار کر لیا گیا ہے۔

اس کا سبب دراصل یہ رہا ہے کہ ہمارے یہاں موجود تنقید کا سارا خاکہ شعری ادب سے مستعار ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہماری زبان میں نثر نگاری کا رواج نظم کے مقابلے ذرا دیر سے ہوا اور جس دور میں یہ رواج ہوا، شاید اس وقت کے سیاسی اور سماجی ماحول میں ان باتوں پر گہرائی سے غور و خوض ممکن نہیں تھا کہ نثر کی ادبی جمالیات کیسے متعین کی جائیں۔ چنانچہ جلد بازی میں جو ممکن ہوا اسے اپنا لیا گیا اور بعد میں بھیڑ چال کی عادت کے طفیل بس اس کی پیروی کی جاتی رہی۔ اب جبکہ وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں کی پسند و ناپسند اور ان کے معیارات بدلے ہیں اور نثر شعر کے مقابلے میں زیادہ مقبول اور معاشرے کے لیے زیادہ زود اثر وسیلہ ثابت ہو رہی ہے تو اس جانب کچھ توجہ دی جانے لگی ہے اور اب اس قسم کا مزاج تعمیر ہونے لگا ہے کہ نثر میں ادب اور غیر ادب میں تفریق کے پیمانے متعین کیے جائیں لیکن اس کے باوجود شعر کی جمالیات کا اثر ہمارے اوپر اس حد تک مسلط ہے کہ ہم مکمل طور پر اس سے اپنا دامن نہیں چھڑا پا رہے ہیں۔ ہم آج بھی افسانے کی شعریات، ناول کی شعریات، یہاں تک کہ تنقید و تحقیق کی شعریات جیسی اصطلاحات کے استعمال پر جیسے خود کو مجبور پاتے ہیں۔ آج بھی نثر کی ادبی جمالیات کے تعین کے لیے ہمارے پاس کوئی ایسا طے شدہ تنقیدی لائحہ عمل نہیں ہے جیسا کہ شعریات کے لیے موجود ہے۔ ظاہر ہے جب تک یہ سلسلہ جاری رہے گا ہماری تنقید میں معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کے برعکس نظم کو نثر پر اسی طرح فوقیت حاصل رہے گی۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ان اصطلاحات کا استعمال جبر کا نہیں ہماری تنقید کے عجز اور نقادانِ ادب کی سہل پسندی کا نتیجہ ہے۔ ہمارے بیشتر ناقد صرف آزمودہ فن کاروں پر اپنے جوہر قلم کو آزمانے کے عادی ہیں۔ ایسے میں ابن صفی پر قلم اُٹھانا یا ان کے بارے میں ایسی بات کہنا جو ابھی تک کسی نے نہیں کہی، یا جو باتیں بزرگ کہہ چکے ہیں ان کی مخالفت کرنے سے ان کی عافیت اور اعتبار دونوں کے لیے خطرہ پیدا ہو سکتا ہے اور وہ ایسا کوئی خطرہ مول لینے کو بالکل تیار نہیں ہیں۔ اگر توجہ دیں تو معلوم ہوگا کہ دراصل ابن صفی تنقید کی اسی گمراہی اور ناقدین کے اسی غیر آزمودہ انجانی دنیاؤں سے خوف کے ہی شکار ہوئے ہیں۔ ورنہ اپنے دل کی گہرائیوں میں ان میں سے بیشتر نے ابن صفی کو وہی مقام دے رکھا تھا جو کسی ادیب یا ادبی فنکار کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ پھر بھی اس صورت حال سے بددل ہونے کی

ضرورت نہیں ہے۔ بدلتے وقت کے تقاضے خود بھی تنقید کے معیار کو بدلتے رہنے کا کام انجام دیتے رہتے ہیں۔ نثر کی برتری کے اس دور میں ایک بار پھر بندھے ٹکے معیارات میں تبدیلی ناگزیر ہے جو آج نہیں تو کل رواج میں آئے گی۔ جیسے ہی نثری ادب کے پیمانے متعین ہوں گے، ابن صفی کی تحریروں میں وہ قوت موجود ہے کہ وہ خود بخود اپنی اہمیت کا لوہا منوالیں گی۔ بالکل اسی طرح جیسے بیسویں صدی کے نصف اول میں عوامی تحریکات کا غلبہ ہوجانے کے بعد نظیر اکبرآبادی جیسے راندۂ درگاہ شاعر کو ازسرنو دریافت کرلیا گیا تھا۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ ہمارے ذہنوں میں نظم ونثر کی اثر اندازی کا یہ گورکھ دھندا غیر محسوس طریقے سے کس طرح اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر علی عمران کا یہ مکالمہ 'صرف دو چار جوتوں سے بندے کی عزت پر حرف نہیں آتا اور ہزار دو ہزار جوتے مارنے کون آتا ہے' جب ابن صفی کی نثر میں ہوتا ہے تو اسے سستا مزاح کہہ کر نظر انداز کرتے ہوئے ادب سے خارج سمجھا جاسکتا ہے لیکن جب ظریف لکھنوی کی نظم میں:

سو جوتوں سے کم رتبہ عالی نہیں ہوتا
عزت وہ خزانہ ہے کہ خالی نہیں ہوتا

شعر کی شکل میں آتا ہے تو جمالیاتی سطح پر ابن صفی کے مکالمے سے کم مرتبہ ہونے کے باوجود ادب کا حصہ صرف اس لیے بن جاتا ہے کہ نظم میں ہے۔

خود ابن صفی بھی نثر و نظم کے اس فرق کو بخوبی محسوس کررہے تھے۔ انہوں نے عمران سیریز کے اپنے ناول 'پاگل کتے' میں اس بُعد کو محسوس کرتے ہوئے کیا خوب تبصرہ کیا ہے۔ درج ذیل مثال سے ہمیں اُس وقت کی صورت حال کا علم بھی ہوتا ہے اور ابن صفی کے لہجے کی کاٹ اور رواں عہد پر ان کی گرفت کا اندازہ بھی:

"کیا آپ نے بچوں کے لیے کہانیاں لکھی ہیں؟"

"نہیں جناب! یہ وہ کتاب ہے جو دنیائے ادب میں تہلکہ مچادے گی۔"

"چڑیا چڑے کی کہانی؟" نواب مشکور نے حقارت سے کہا۔

"آہا۔ آپ نہیں سمجھے۔ یہ تمثیلی کہانیاں ہیں جناب، چڑیا سے مراد ہے اپنا ملک اور چڑے کو وزیراعظم سمجھ لیجیے۔ جس طرح چڑا چڑیا کے لیے بے تاب ہے اسی طرح وزیراعظم ملک کی حالت سدھارنے کے لیے بے چین ہے اور انڈے بچے ہم لوگ ہیں۔ جی ہاں۔"

"کیا بکواس ہے۔"

"ارے واہ! بکواس اس لیے ہے کہ نثر میں ہے۔ اگر میں نے اس خیال کو نظم کردیا ہوتا تو مشاعرے الٹ جاتے جناب۔" عمران ہاتھ نچا کر بولا۔

یہ شکایت اپنی جگہ بجا ہے کہ ہماری تنقید نے ابن صفی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ہے لیکن اس رویے کو درست نہیں کہا جا سکتا کہ ہر وہ چیز جو ابن صفی کی حمایت میں ہو اس کی تائید اور جو اس کے خلاف ہو اس پر لعن طعن کی جائے۔ یہ غلامانہ اور عاقبت نااندیشانہ رویہ بھی ہماری ادبیات کے لیے خاصا مہلک ہے کہ مغرب سے آنے والی ہر بات معتبر اور مشرق کی ہر آواز مہمل ہے۔ مشرق میں کیا ہو رہا ہے اس کا اچھا تجربہ اہل مشرق پر ہی چھوڑ دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ مغرب میں جو کچھ ہو رہا ہے یا وہاں مشرق کے بارے میں جو کچھ کہا جا رہا ہے، اس کی مکمل تحقیق و تفتیش کیے بغیر نہ اس پر واویلا مچانے کی ضرورت ہے اور نہ چراغاں کرنے کی کیونکہ ہمارا تجربہ شاہد ہے کہ مشرق کے بارے میں ان کا کوئی قول کوئی عمل کسی مصلحت سے خالی ہو، اس کی توقع کم ہی رہتی ہے۔ یہ کوئی اہم بات نہیں ہے کہ اگاتھا کرسٹی ابن صفی کے بارے میں کچھ دل خوش کن باتیں کہہ دیتی ہیں۔ وہ بھی اس اعلان کے ساتھ کہ نہ تو وہ اردو جانتی ہیں اور نہ انہوں نے کبھی ابن صفی کو پڑھا ہے، تو ہمیں پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اگاتھا کرسٹی نے جو کہا ہے اس کی بنیاد کیا ہے۔ ظاہر ہے یہ باتیں ہوائی اور زیادہ سے زیادہ سنی سنائی ہیں اور ہم انہیں صرف اس لیے اہمیت دے رہے ہیں کیونکہ یہ ابن صفی کے حق میں ہیں اور ایک مغربی خاتون مصنف کے دہن مبارک سے برآمد ہوئی ہیں۔ یہ عمل ہماری اس غلامانہ ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے جس کے تحت ایک عرصے سے مغرب ہمارے حواس پر طاری ہے اور مغرب کی ہر بات ہمارے لیے مشرق سے زیادہ معتبر ہے۔ ایسے اوقات میں ہم اس معمولی سی بات کو بھی فراموش کر دیتے ہیں کہ کسی مہمان سے جب کوئی میزبان اپنی کسی اہم چیز کے بارے میں رائے طلب کرتا ہے تو اس کے جواب کو تنقیدی نہیں، اخلاق کے مظاہرے کی ایک شکل اور مصلحت کے زیر اثر سمجھا جاتا ہے کیونکہ ایسی صورت حال میں اس مہمان کی منشا بس یہ ہوتی ہے کہ اس کی باتوں سے اس کا مہمان خوش ہو۔

ابن صفی ہمارا ایسا ناول نگار ہے جو اپنے اظہار کی قوت کی بنیاد پر خود اپنی اہمیت منوا لینے کا دم خم رکھتا ہے۔ دیکھا جائے تو اس کے کارنامے انسان کی فنی صلاحیتوں کی معراج ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ خود بھی مشرقی تہذیب کا دلدادہ اور مغرب کا مخالف ہے۔ اس لیے ہمیں اس کے حسن و قبح پر گفتگو کرتے وقت اس حد تک جذباتی نہیں ہونا چاہیے کہ صحیح غلط کی تمیز ہی مشکل ہو جائے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ابن صفی نے سری ادب میں ایک نئی راہ نکالی تھی۔ یہ ایک ایسی راہ تھی جو اُن کے پیش رووں کی طرح سرزمین ادب کے قریب سے نہیں اس کے اندر سے گزرتی تھی اور ایسا انداز تحریر صرف اردو ہی میں نایاب نہیں ہے دیگر ہندوستانی اور مغربی زبانوں میں بھی ناپید ہے۔ جاسوسی یا اسی نوع کے دوسرے ناولوں میں جن میں تاریخی اور مذہبی ناولوں کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے، اتنی نستعلیق زبان کا استعمال عام طور پر نہیں ہوا تھا۔ تو یہ

فطری تھا کہ جاسوسی ناول کا ٹھپہ لگ جانے کے بعد جس زاویے سے اس نوع کے ناولوں کو دیکھا جاتا تھا، ابن صفی کے ناولوں کو بھی اسی طرح دیکھا گیا اور دوسروں کی طرح ابن صفی کو بھی ادب سے ٹاٹ باہر رکھا گیا۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔ اب اگر اس کی تحریریں ادب میں داخل ہونے کے لائق ہیں، جیسا کہ ہم میں سے اکثر کا خیال ہے تو ہمیں اس ناانصافی کے ازالے کے لیے سامنے آکر مثبت انداز میں اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ انہیں ادب میں ان کا جائز مقام مل سکے۔

لیکن پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ ابن صفی کے بارے میں ہمارے پاس جس طرح کا تنقیدی سرمایہ مہیا ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ ہمارے ناقدین نے ابن صفی کے ساتھ اچھا یا برا کس طرح کا سلوک کیا ہے؟ اور ممکن ہو سکے تو یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی کریں کہ جو ناقدین کھل کر نہیں بول پا رہے ہیں ان کی اس احتیاط کے پیچھے کیا اسباب رہے ہوں گے۔ اس بات کو جاننے سمجھنے کے لیے شاید درج ذیل اقتباسات ہماری کچھ مدد کر سکیں:

''اگرچہ میں اسے حقیقت سے فرار کا ادب مانتا ہوں لیکن اگر رسالہ میرے ہاتھ لگ جاتا ہے تو شروع سے آخر تک پڑھ ڈالتا ہوں۔ میری بیوی تو باقاعدگی سے پڑھتی ہے۔''

(احتشام حسین)

''ابن صفی کے ناولوں میں بڑی حد تک اطمینان بخش خصوصیت یہ ہے کہ ان میں زبان کا معیار قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ یہ خصوصیت ادب کے اعلیٰ میزان پر بھی پوری اترتی ہے مگر پھر بھی ابن صفی اپنے افسانوں میں زبان کی دلکشی اور تھوڑی بہت ادبی چاشنی قائم رکھنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ اس کو تسلیم کرتے ہوئے بھی ان سے کچھ شکایتیں باقی رہتی ہیں۔ مثلاً وہ بلاوجہ بعض ترکیبیں ایجاد کرتے ہیں جو نہ صرف غیر ضروری ہوتی ہیں بلکہ بے معنی بھی۔ ایک ترکیب سے ابن صفی کو بڑا شغف معلوم ہوتا ہے اور وہ ہے 'تشویش کن' جس سے ان کا کوئی ناول خالی نہیں ہوتا بلکہ بعض ناولوں میں تو ہر صفحے پر اسی ایجاد سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تشویش کن کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اگر اس کے کوئی معنی نکلتے تو اسے گوارہ کر لیا جاتا۔ وہ تشویش کن کو بھی پرتشویش کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ کبھی تشویش ناک مراد ہوتی ہے اور کبھی تشویش انگیز۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان تین مستعمل اور بامحاورہ ترکیبوں کے ہوتے ہوئے وہ تشویش کن کی ترکیب کیوں استعمال کرتے ہیں۔''

(مجنوں گورکھپوری، اردو میں جاسوسی افسانہ، بحوالہ آمد، اکتوبر تا دسمبر 2012)

''اس میں شک نہیں کہ لوگ ابن صفی کے ناول تفریحی مشغلے کے طور پر پڑھتے تھے تاکہ ایک بے کیف زندگی سے باہر نکل کر سنسنی اور تفریحی سکون محسوس کر سکیں۔ ان کہانیوں میں انہیں پُر آسائش زندگی، حسین

عورتیں یا مرد، بڑی کاروں، اقتدار اور دوسروں پر اختیار اور بدی پر نیکی کی فتح کے خواب سچ ہوتے دکھائی دیتے تھے۔ وہ خطرناک حالات کی سنسنی کا اور ممنوعہ اعمال (منشیات و شراب نوشی کی کثرت اور ناجائز جنسی تعلقات) کی متصورہ اور ممنوعہ لذتوں کا تجربہ کر سکتے تھے، جو ویسے ہمیشہ برے کرداروں سے وابستہ ہوتے تھے اور جن کا واضح اور تفصیلی بیان کبھی نہیں کیا جاتا تھا...ابن صفی کی تحریروں میں بعض آدرش اسی بالواسطہ انداز میں تشکیل پاتے ہیں۔"

(کرسٹینا اویسٹر ہیلڈ، ادب ساز دہلی، جنوری تا جون 2008)

"جن عناصر نے ہندوستان میں اردو کتابوں کے مطالعے کی روایت کو برقرار رکھا، ابن صفی ان عناصر میں سے ایک عنصر تھے... ہر شمارے کے ساتھ ابن صفی کے اسلوب میں پختگی آتی گئی، کرداروں پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی گئی، کہانیوں کی بنت میں ماہرانہ انداز ابھرتا گیا۔ پھر یہ صرف جرم و سزا کی کہانیاں نہیں تھیں، ان میں انسانی نفسیات کے مطالعے بھی تھے، خاندانی جھگڑوں اور موروثی خصوصیات کے عناصر بھی تھے، مجرموں کی انڈر ورلڈ کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کا اظہار بھی تھا کہ جرائم کا ارتکاب ہمارے اجلے معاشرے کے اجلے لوگ بھی کرتے ہیں... اچھا لکھنے والا جاسوسی ناول میں بھی انسانی نفسیات کی گہرائیوں میں سفر کرتا ہے۔ ابن صفی کے ہاں صرف اس بات کی اہمیت نہیں کہ آگے کیا ہوگا۔ ان کے ہاں ہمیں فریدی، حمید، قاسم، عمران، جوزف، سلیمان، روشی، جولیا کی رفاقت میں اچھا وقت گزارنے کا موقع ملتا ہے۔"

(ابوالخیر کشفی، کچھ ابن صفی کے بارے میں، آمد، اکتوبر تا دسمبر 2012)

"جو لوگ جاسوسی ناولوں کے مطالعے کو وقت کے ذبح کرنے کا اچھا ذریعہ سمجھتے ہیں، کیا میں ان سے پوچھ سکتا ہوں کہ دوسرے ادبی ناولوں کے مطالعے کا مقصد وقت گزاری کے علاوہ کیا ہوتا ہے۔ کیا ہم ان ناولوں کو پڑھ کر زندگی کے مسائل حل کرتے ہیں؟ کیا زندگی کی الجھنوں کا حل ڈھونڈنے کے لیے ہم ان ناولوں کو پڑھتے ہیں؟ کیا ہم یہ ناول اس غرض سے پڑھتے ہیں کہ ان سے ہماری زندگی متاثر ہو؟ کیا کوئی ادب پارہ براہ راست زندگی کو متاثر کرتا ہے یا اس کا اثر بالواسطہ ہوتا ہے۔"

(اسحاق اطہر صدیقی، عظیم ادیب اور ناول نگار، اردو بک ریویو، جولائی اگست 2001)

"ہندی اردو میں حالانکہ ناول کی دوسری قسمیں بہت پھلی پھولیں لیکن جاسوسی ناول پنپ نہیں پائے۔ سبب شاید یہ ہے کہ جہاں مغرب میں فٹ پاتھیا ادب یعنی پلپ فکشن (Pulp-Fiction) کی اپنی جگہ ہے، وہیں ہندی اردو کا تنک چڑھا پن، محدود فکر، تعصب کا مزاج اور ادب کے لیے لسانی معیار پسندی کا نظریہ جاسوسی ناولوں کو برہمن معاشرے میں 'اچھوت' کی طرح بنائے ہوئے ہے۔"

(نیلا بھ، ابن صفی کے ناولوں کے جدید ہندی مترجم)

''ابن صفی کا شمار گو کہ پاپولر فکشن رائٹر میں ہوتا ہے اور انہوں نے عمر بھر جاسوسی ناول لکھے لیکن ان جاسوسی ناولوں میں ان کی زبان پر جو دسترس ظاہر ہوتی ہے اور جو ان کا انداز تحریر ہے، اسی بدولت انہیں اردو ادب میں ایک ممتاز مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اردو ادب میں موضوعات کو داخلی اور خارجی کیفیات تک محدود کر دیا گیا ہے جبکہ دوسری زبانوں کے فکشن میں ہر طرح کے موضوع پر مواد ملتا ہے۔ آج دنیا دہشت گردی کے جس عفریت کا شکار ہے، سائنس اور ٹکنالوجی میں جو حیرت انگیز ترقی ہو رہی ہے، اردو فکشن ان مظاہر سے دور ہی رہتا ہے، مگر ابن صفی نے اپنے جاسوسی ناولوں میں ان موضوعات کو اس وقت تحریر کیا جب یہ مسائل دنیا کے سامنے نہیں تھے۔''

(آصف ملک، روزنامہ ایکسپریس، کراچی، 28 جولائی 2005)

ابن صفی جس زمانے میں اپنے جاسوسی ناول لکھ رہے تھے، وہ وقت کے تقاضے کے تحت ایسے ناولوں کے لیے موافق کہا جاسکتا ہے کیونکہ یہ وہ زمانہ ہے جب دنیا دو عظیم جنگوں سے ملے دکھ کا بوجھ اپنے کندھوں پر محسوس کر رہی تھی اور راحت و سکون کی متلاشی تھی۔ جب ہندوستان اپنی تحریک آزادی کے انجام پر آنسو بہا رہا تھا۔ جب اردو ادبیات میں ترقی پسند تحریک اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی اور ادب کے لیے کسی نئے سہارے کی تلاش کا عمل جاری تھا۔ عوام اور عوام پسند ادب کی حمایت میں لوگ کھل کر سامنے آچکے تھے۔ اردو شعر و ادب میں گزرے ہوئے تیس چالیس برسوں میں بڑی انقلابی تبدیلیاں آئی تھیں۔ کسی بھی ادیب کے لیے اس عہد کا سب سے بڑا فریضہ اپنے قاری کو سکون اور اطمینان فراہم کرنا تھا۔ ابن صفی نے اپنی بساط بھر یہ کام کیا۔ یہ زمانہ عوام کو ادب سے جوڑنے کے لیے یاد کیا جاتا ہے۔ ابن صفی بھی عوام کے لیے لکھ رہے تھے۔ عوام انہیں پسند بھی کر رہے تھے بلکہ ضرورت سے زیادہ پسند کر رہے تھے۔ تو پھر وہ کیا اسباب تھے کہ اس عہد کے ناقد ابن صفی کے تعلق سے اتنے محتاط تھے۔

عوام کی حمایت کا دم بھرنے والی ترقی پسند تحریک میں اس وقت تک باہمی خلفشار در آیا تھا اور اس سے وابستہ لوگ ادب کی فکر کرنے کے بجائے اپنی اپنی بقا کی جدوجہد میں معروف ہو گئے تھے۔ سیاست اور مذہب میں جو رسہ کشی ہو رہی تھی اس میں ایک وقت ایسا بھی آ گیا تھا جب ادب کو بھی سیاست کی عینک سے دیکھا جانے لگا اور سچائی یہ ہے کہ اس عہد میں خدا پر کامل یقین رکھنے والے اور صرف اپنی تحریروں کے پیچ و خم میں الجھے، گوشہ نشین ابن صفی اس سیاسی عینک سے کچھ زیادہ دلکش نظر نہیں آ رہے تھے۔ ان کا مقصد وہ نہیں تھا جو اس عہد کے سرکردہ لوگ چاہتے تھے۔ چنانچہ انہیں پسندیدہ نظروں سے دیکھنا، ان پر کچھ لکھنا یا ان کی حمایت میں آگے آنا اس عہد کے نقادوں کے لیے اہمیت ہی نہیں رکھتا تھا۔ بالفرض وہ ایسا

کرتے بھی تو یہ صرف ابن صفی کا اعتراف ہی نہ ہوتا بلکہ اس عہد کے بیشتر ادیبوں کی نفی کا ثبوت بھی ہوتا جو وہ نہیں چاہتے تھے۔ بغور دیکھیں تو ابن صفی خود اپنی ذات میں ایک تحریک تھے، ایسی تحریک جو کسی بھی خارجی تحریک سے زیادہ مستحکم، زود رس اور ثابت قدم تھی۔ وہ اپنی اس داخلی تحریک کے مقاصد کے حصول کے لیے کام کر رہے تھے اس لیے معاصر معاشرہ ایک طرح سے ابن صفی کو نظر انداز کرنے پر مجبور تھا۔ بدقسمتی سے اس کے بعد جو عہد آیا، وہ تو اس طرح کے ادب کا سرے سے مخالف اور مجموعی طور پر تخلیقی ادب کے لیے مہلک بھی تھا تو اس کے ناقدوں سے ابن صفی کے حق میں کسی قسم کی مثبت تحریر کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ ہاں یہ اپنی جگہ حقیقت ہے کہ یہ سب جو ابن صفی کی حمایت میں لب کھولنے کو تیار نہیں تھے، ابن صفی کی تحریروں کو اپنے اپنے دکھوں کا مداوا اور اپنی تنہائیوں کا رفیق سمجھتے تھے اور خفیہ طور پر اس طرح ان کا مطالعہ کرتے رہتے تھے کہ کوئی انہیں ایسا کرتے دیکھ نہ لے اور ایسے لوگوں میں ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے سب شامل تھے۔ جس معاشرے میں یہ دوغلا پن در آیا ہو وہاں حق گوئی کی اُمید کرنا ہی فضول لگتا ہے لیکن شاید اب وہ زمانہ آ گیا ہے جب ابن صفی پر کھلے دل و دماغ سے باتیں کرنا ممکن ہوا ہے۔ درج بالا اقتباسات میں سے چند اس بات کی شہادت بھی دے رہے تھے کہ اب ابن صفی کے ساتھ انصاف ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔

اگر ہم ان اقتباسات کو بغور دیکھیں تو ان میں ایک دبی سی بات ہمارے کام کی اور لائق توجہ ہے۔ وہ یہ کہ بھلے ہی ان میں سے اکثر ناقدین کھل کر ابن صفی کی حمایت میں نہیں آ رہے تھے لیکن واضح طور پر ان کی مخالفت بھی نہیں کر پا رہے تھے۔ اس رویے کا تجزیہ ہونا ابھی باقی ہے اور اس کام کو نہایت تندہی اور دیانت داری سے کیے جانے کی ضرورت ہے۔ البتہ یہاں اتنا تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ ناقدین کے اس محتاط رویے نے آنے والے وقت میں ابن صفی پر صالح تنقید کے دروازے ضرور کھول دیے تھے۔

(۳)

یہ باتیں اب بالکل صاف ہو چکی ہیں کہ نہ تو موضوع میں ادب ہوتا ہے اور نہ کسی موضوع کی ادب میں ممانعت ہے۔ ادب میں ہر طرح کے موضوع کی گنجائش موجود ہے بشرطیکہ اظہار میں ان لوازم کا خیال رکھا گیا ہو جنہیں ہم ادبی جمالیات کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور جسے تخلیقی ادب کے لیے ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ ادب کی اخلاقیات بہرحال کچھ ایسی باتوں کی اجازت نہیں دیتی جو مخرب اخلاق ہوں، تمدن پر ضرب لگاتی ہوں، تہذیب کی بنیادی اقدار کی بقا کے لیے خطرہ کھڑا کرتی ہوں یا جس میں انسانیت کو ضرر پہنچانے کے امکانات پوشیدہ ہوں۔ ابن صفی کے ایک مداح عارف اقبال نے اپنے ایک مضمون (ابن صفی کا اردو کے عوامی کردار میں تاریخ ساز کارنامہ) میں ابن صفی سے جو باتیں وابستہ کی ہیں

ان میں سے ہم کسی سے انکار نہیں کر سکتے۔ کیا ابن صفی نے اپنے قارئین کو اپنے ساتھ ساتھ اردو کا گرویدہ نہیں بنایا، کیا انہوں نے اپنی تحریروں سے ایک باوقار اور صالح معاشرے کی تشکیل و تعمیر میں حصہ نہیں لیا، کیا مختلف وجوہ کی بنا پر جاری وساری سطحی عشق و عریانیت اور فحاشی کے سیلاب کو کامیابی سے نہیں روکا، کیا انہوں نے تفریحی ادب کے متلاشیوں کی تسکین کا سامان فراہم نہیں کیا، کیا انہوں نے غیر اردو داں طبقے کو اردو کی شیرینی کی جانب متوجہ نہیں کیا، کیا انہوں نے لوگوں کی روزمرہ کی زبان کو بہتر نہیں بنایا، کیا وہ ایک رجحان ساز ادیب نہیں تھے، کیا انہوں نے ہندوستان میں اردو کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا نہیں دیا، کیا انہوں نے اپنے ناولوں میں زندہ جاوید کردار تخلیق نہیں کیے؟ اگر ہم ان میں سے کسی بات سے انکار نہیں کر سکتے تو پھر ابن صفی کی تحریروں میں وہ کون سی کمی یا خامی ہے جو ان کو دوسرے عہد ساز ادیبوں کی صف میں کھڑا ہونے سے روکتی ہے۔

ایک بات تو واضح ہے کہ ابن صفی کے مخالفین بھی اس بات کا کھلے طور پر اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے زبان کی بقا اور اس کی ترویج و اشاعت کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس لیے اس تعلق سے یہاں گفتگو نہیں کرنی ہے۔ مسئلہ زبان کی ترویج و اشاعت کا نہیں ان کی تحریروں کے ادبیات میں شمولیت کا ہے۔ اس لیے مباحث کا دائرہ بس یہیں تک رہے تو بہتر ہوگا۔ ادب کیا ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ ادب انسان کے تجربات، مشاہدات، مظاہرات، مطالعات، جذبات و احساسات وغیرہ کا جمالیاتی اظہار ہے۔ ہم نے اپنے شعری ادب میں اس جمالیات کا بہترین استعمال دیکھا ہے اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ اظہار میں جمالیات کے لیے ہم کن کن راستوں سے گزر سکتے ہیں۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ شعریات میں ادب اور غیر ادب کی حدود فاصل کیا ہیں۔ نثر میں بھی ہم نے جمالیات کا استعمال دیکھا اور محسوس کیا ہے لیکن یہاں ہم ابھی تک یہ متعین نہیں کر سکے ہیں کہ اس جمالیات کے برتنے کے ضابطے کیا ہیں۔ چنانچہ یہاں ہمیں اس سطح پر خاصی بے راہ روی اور طوائف الملوکی نظر آتی ہے۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ نثر میں جمالیات کا استعمال بہرحال شعر میں جمالیات کے استعمال سے مختلف ہے اور اکثر شعری طریقۂ کار نثر میں ممکن بھی نہیں ہو پاتا ہے۔ اس لیے اس پر ابھی مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ ادب انسانی محسوسات کی ایسی باز گوئی ہے جس سے ذہن انسانی پر وہی عکس دوبارہ بن سکے جو اصل میں ایسے واقعات کو دیکھنے سے بن سکتا ہے اور ناول کی صنف جس خوبصورتی سے اس بازدید کو ممکن بناتی ہے، اس کی کوئی دوسری مثال ادب میں نہیں مل سکتی۔ نہ نظم میں نہ نثر میں۔

لیکن مجھے یہاں اس مسئلے کو حل کرنے سے غرض نہیں ہے کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ یہ طے کرنا ایک شخص کے بس کا روگ ہے بھی نہیں۔ اس کے لیے لکھنے والوں کے درمیان رائے عامہ کا ہموار ہونا ضروری ہے

اور اس کے لیے وقت درکار ہے۔ میں تو یہاں بس اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ جذبۂ تحیر، جو اس وقت ہمارا موضوع بحث ہے، ایک ایسی انسانی صفت ہے جسے نظم و نثر میں جمالیات کی حیثیت سے یکساں طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے اور دیکھا جائے تو اس جذبۂ حیرت نے انسان کو مستقبل کے خواب بھی دکھائے ہیں اور اسے کئی مصائب سے محفوظ بھی رکھا ہے۔ چنانچہ یہ مفروضہ کہ سرّی طریقۂ اظہار ادب کا حصہ نہیں ہوسکتا، سرے سے مہمل ہے۔ شعری ادب میں ہمیں اس طرح کے اشعار وافر تعداد میں مل جاتے ہیں جہاں اسرار کی دنیائیں آباد کی گئی ہیں:

ہم نے انسانوں کے دُکھ درد کا حل ڈھونڈھ لیا
کیا برا ہے جو یہ افواہ اُڑا دی جائے

چمن میں جا کے بھولے سے میں خستہ دل کراہا تھا
کیا کی گل سے بلبل حیلہ دردِ گلو برسوں

غموں کا اب کوئی موسم نہیں ہے
یہ میلہ سال بھر لگنے لگا ہے

قفس کو باغ میں جانے نہ دیجو
کہ ناحق خون پروانوں کا ہوگا

مندرج اشعار میں پہلے اور دوسرے مصرعے کے درمیان اسرار و اشتیاق اور تجسس و حیرت کی جو تہیں پوشیدہ ہیں، یہاں اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ انہیں ہر وہ شخص آسانی سے محسوس کرسکتا ہے جو ادب کی سمجھ رکھتا ہے۔ ان کو اور ایسے متعدد اشعار کو، جو ہمارے ذخیرۂ ادب کا قابل قدر حصہ ہیں، اگر ادبیات سے خارج کیا جاسکتا تو یقیناً ہمیں نثری ادب کی تخلیقیت اور ادب پر گفتگو میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑسکتا تھا لیکن ہم جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ پھر یہ اشعار معمولی شعرا کے نہیں ہیں اور خاصا وقت گزر جانے کے بعد بھی ابھی تک نہ تو ان پر کسی نے کوئی سوالیہ نشان لگایا ہے اور نہ غیر ادبی ہونے کا حکم صادر کیا ہے۔ چنانچہ اگر اسرار کی ان پوشیدہ پرتوں کے باوجود ان اشعار اور ان کے شاعروں کا شمار ادب میں کیا جاسکتا ہے تو ہمیں ابن صفی اور ان کی تحیر آمیز تحریروں پر یقیناً مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

(۴)

اب ہم اس مرحلہ پر آگئے ہیں کہ ابن صفی کی تحریروں کے کچھ اقتباسات کو پیش نظر رکھ کر یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ جس ادبی جمالیات کا تذکرہ ہم کررہے ہیں وہ ابن صفی کے یہاں موجود بھی ہے یا نہیں۔ ان اقتباسات سے شاید یہ بات بھی واضح ہوجائے کہ نثر میں جمالیات کی اختراع کے لیے ابن صفی نے

جو مشقت کی ہے وہ دوسرے مصنفین کے مقابل کہاں ٹھہرتی ہے یا انسانی نفسیات پر ان کی گرفت دوسرے معاصر مصنفین جیسی تھی یا نہیں یا تبدیل ہوتی ہوئی سماجی اقدار کا ادراک انہیں تھا بھی یا نہیں یا وسیلۂ اظہار کے طور پر زبان کے استعمال پر انہیں قدرت حاصل تھی یا نہیں۔ ان اقتباسات سے ہمیں ان جیسے کئی دوسرے سوالوں کے جواب حاصل کرنے میں بھی آسانی ہوگی۔ دیکھیے:

''خانہ بدوشی کی زندگی اور کتوں کی زندگی میں کیا فرق ہے؟ کچھ بھی ہو... لیکن دنیا کی زیادہ تر آبادی کتوں ہی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ کچھ کو پالتو بنالیا جاتا ہے اور کچھ آزادی سے کم از کم بھونک تو سکتے ہیں۔ میں دوسری قسم کے کتوں کی نسل سے تعلق رکھتا ہوں۔'' (گیت اور خون)

''کیپٹن حمید اپنی میز پر تنہا تھا۔ تنہا اور اُداس۔ تنہائی اور اُداسی برحق۔ نہ اُسے کسی کا انتظار تھا اور نہ کسی خاص مقصد کے تحت یہاں آیا تھا۔ نہ اُداسی لائی تھی اور نہ تنہائی۔ اُداس تو وہ یہاں پہنچ کر ہو گیا تھا... اُس نامعلوم سی اُداسی کا دورہ اکثر پڑتا تھا۔ اب اس وقت اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سوچا اور کافی کے گھونٹ پہلے سے بھی زیادہ تلخ محسوس ہوئے۔ کس کی تلاش ہے اسے، کیا کسی عورت کی ہم نشینی کا خواہش مند ہے۔ یہ بھی نہیں تو پھر کیا چاہتا ہے؟ تبدیلی... محض تبدیلی۔ اس کا ذہن کسی بچے کی طرح چیخ پڑا۔ معمولاتِ زندگی کی یکسانیت بغیر کمائے ہوئے چمڑے کے جوتوں کی طرح تکلیف دہ ہوگئی تھی۔''
(رلانے والی)

''آدمی کا جسم ہی اُس کا وطن ہے اور ایک دوسرے کے وطن کی حفاظت ہر آدمی کا فرض ہے۔''
(تابوت میں چیخ)

''نیچر آدمی کو بری طرح اُلو بناتی ہے۔ وہ ورڈز ورتھ ہو جاتا ہے، کیٹس ہو جاتا ہے، بائرن ہو جاتا ہے، میر ہو جاتا ہے، غالب ہو جاتا ہے۔ دفتر کے دفتر سیاہ کرتا ہے۔ مگر مقصد... مقصد ان سب کا صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بچے کا باپ بننا چاہتے ہیں۔'' (لڑکیوں کا جزیرہ)

''جب ایک آدمی پاگل ہو جاتا ہے تو اسے پاگل خانے میں بند کر دیتے ہیں اور جب پوری قوم پاگل ہو جاتی ہے تو طاقت ور کہلانے لگتی ہے۔''
(اُلو کے رقاص)

''برتر وہی ہے جو بے وقوف ہے۔ جتنا بے وقوف اتنا ہی برتر۔ پہلے مرد عورت پر حکومت کرتا تھا... طاقت سے۔ اب بے وقوف یعنی برتر بنا کر حکومت کرتا ہے۔ برتر بنا کر حکومت کرنے میں دوہرا فائدہ ہے یعنی عورت پر دوہری ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔ وہ انہیں خود سے برتر بنا کر گھروں کی چار دیواریوں سے نکال لاتا ہے۔ انہیں اپنے دوش بہ دوش کام کرنے کا موقع دیتا ہے۔ رہ گئے چار دیواری

والے فرائض تو عورت انہیں عادتاً انجام دیتی ہے۔" (آہنی دروازہ)

"میں جانتا ہوں کہ حکومتوں سے سرزد ہونے والے جرائم جرائم نہیں حکمتِ عملی کہلاتے ہیں۔ جرم تو صرف وہ ہے جو انفرادی حیثیت سے کیا جائے۔"

(جونک کی واپسی)

"تربیت ضروری چیز ہے۔ یہ کیا کہ ایک معمولی کلرک کو کلرکی کا امتحان دینا پڑے۔ ایک پولیس کانسٹبل رنگروٹی کا دور گزرے بغیر کام سے نہ لگایا جائے لیکن ترکاریوں کے آڑھتی اور گاؤدی قسم کے تاجر براہ راست اسمبلیوں میں جا بیٹھیں اور قانون سازی فرمانے لگیں اور ان ہی میں سے کچھ کابینہ کے ارکان بن جائیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ نچلی سطح پر امتحانات اور ٹریننگ کا چکر چلتا رہے اور اوپر جس کا دل چاہے پہنچ جائے۔ بس جیب بھاری ہونی چاہیے۔ نہ کوئی امتحان اور نہ کوئی ٹریننگ۔" (جنگل کی شہزادی)

"آدمی کتنا پیاسا ہے۔ تم اسے پیاسا سمندر کہہ سکتی ہو جو پانی ہی پانی رکھنے کے باوجود بھی ازل سے پیاسا ہے اور اس وقت تک پیاسا ہی رہے گا جب تک کہ اسے اپنا عرفان نہ ہو جائے لیکن ابھی اس میں ہزار ہا سال لگیں گے۔ ابھی تو وہ بچوں کی طرح گھٹنوں چل رہا ہے۔ ابھی تو وہ چاند میں جانے کی باتیں کرتا ہے۔ اس کی ذہنیت اور سوجھ بوجھ اس بچے سے زیادہ نہیں ہے جو ماں کی گود میں چاند کے لیے مچلتا ہے۔ وہ مصنوعی سیارے اُڑا کر اسی طرح خوش ہوتا ہے جیسے بچے صابن کے بلبلے اُڑا کر مسرور ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے شرطیں لگاتے ہیں کہ دیکھیں کس کا بلبلہ دیر تک فنا نہیں ہوتا۔ چاند کا سفر آدمیت کی معراج نہیں ہے۔ چاند کی باتیں تو ایسی ہی ہیں جیسے کوئی اپنے اصل کام سے اُکتا جائے اور بیٹھ کر گنگنانا شروع کر دے۔" (پیاسا سمندر)

"کیا تم مرنا چاہتی ہو؟

ہاں میں مرنا چاہتی ہوں۔

تو اردو کے عشقیہ ناول پڑھنا شروع کر دو۔ تم بہت جلد مر جاؤ گی۔"

(بھیانک آدمی)

"میں جنسیت کو ایک سیدھا سادہ مسئلہ سمجھتا ہوں، جسے آدمی جیسے سمجھ دار جانور کے لیے اتنا پیچیدہ نہ ہونا چاہیے کہ وہ شاعری کرنے لگے۔" (جنگل کی آگ)

"اب تک اس پر دو حملے ہو چکے تھے لیکن حاضر دماغی آڑے آئی تھی ورنہ اس وقت اس کی روح عالم ارواح میں بھیک مانگتی پھر رہی ہوتی۔" (طوفان کا اغوا)

"اگر میں سڑک پر ناچنا شروع کر دوں تو مجھے دیوانہ کہو گے لیکن لاشوں پر ناچنے والے سورما کہلاتے

ہیں۔ انہیں اعزاز ملتے ہیں ان کی چھاتیاں تمغوں سے سجائی جاتی ہیں۔" (خطرناک لاشیں)
"اگر تم قانون کو ناقص سمجھتے ہو تو اجتماعی کوششوں سے اسے بدلنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ اگر اس کی ہمت نہیں ہے تو تمہیں اسی قانون کا پابند رہنا پڑے گا۔ اگر تم اجتماعی حیثیت سے اس کے خلاف آواز نہیں اُٹھا سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس سے متفق ہو۔" (لاش کا بلاوا)
"یہ فرنگی بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ان کی ایک ٹولی لوگوں پر گولیاں برساتی ہے اور دوسری ٹولی زخمیوں کی مرہم پٹی بھی کرتی پھرتی ہے۔ ان کا نشان ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی دو سرخ لکیریں ہوتی ہیں۔" (خطرناک ڈھلان)
"جب کوئی ذہین اور تعلیم یافتہ آدمی مسلسل ناکامیوں سے تنگ آجاتا ہے تو اس کی ساری شخصیت صبر کی تلخیوں میں ڈوب جاتی ہے۔" (موت کی آندھی)
حقیقت یہ ہے کہ ابن صفی کے ناولوں میں سے اس طرح کی بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن ایسی کتنی بھی مثالیں پیش کر دی جائیں، تشفی نہیں ہوگی اور ہمیشہ ایسا ہی محسوس ہوتا رہے گا کہ جیسے ایک قطرے سے سمندر کی بے کرانی کو ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہو۔ اقتباسات کا یہ سلسلہ قدرے طویل ضرور ہو گیا ہے لیکن یہاں مجھے طوالت کے خوف سے زیادہ اس بات کی فکر دامن گیر تھی کہ ان مثالوں نے ابن صفی کی تحریروں کے زیادہ سے زیادہ ایسے پہلو سامنے آجائیں جنہیں بنیاد بنا کر ہمیں یہ فیصلہ لینے میں آسانی ہو کہ انہیں ایک ادیب یا ادبی فنکار سمجھا جانا چاہیے یا نہیں۔ یا یہ کہ وہ محض عوام کی پسند کا ایک معمولی مصنف ہے یا ایک ایسا عہد ساز ادیب بھی ہے جس نے اپنے قلم کی جولانیوں سے زمانے کا رُخ بدلنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ ان اقتباسات کے مطالعے کے بعد قارئین خود اس فیصلے پر پہنچ چکے ہوں گے جس کا رسمی اظہار میں آگے کی چند سطور میں کرنا چاہتا ہوں۔

(۵)

جیسا کہ خالد جاوید نے اپنے مضمون 'ابن صفی: چند معروضات' میں بھی ذکر کیا ہے کہ رولاں بارتھ کے مطابق، جسے ہم ایک ساختیاتی مفکر کی حیثیت سے بخوبی جانتے ہیں، تحریریں دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک کو وہ ریڈرلی (Readerly) تحریر کا نام دیتا ہے اور اس سے وہ ایسی تحریر مراد لیتا ہے جس میں قاری کی دلچسپی صرف متن میں پائے جانے والے ہلکے پھلکے تحیر کے سبب ہوتی ہے۔ اسے ہم عوامی یا غیر ادبی تحریر بھی کہہ سکتے ہیں۔ دوسری قسم کی تحریر کو وہ رائٹرلی (Writerly) کہتا ہے جس میں دوران مطالعہ قاری کو اس تجربے سے گزرنا ہوتا ہے جو دوران تخلیق مصنف کو ہوا ہوگا۔ اسے ہم ادبی تحریر کہہ سکتے ہیں۔ کسی ادیب کے لیے یہ عمل ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنی تحریر کو قاری کا تجربہ بنائے، جو مصنف اس لازمہ کی تہہ میں جتنی

گہرائی تک اُتر پاتا ہے اسے ادب میں اتنا ہی بلند مقام حاصل ہوجاتا ہے۔
رولاں بارتھ کے اس قول کو حالانکہ نثری جمالیات کے کسی متعینہ لائحہ عمل کے طور پر نہیں پیش کیا جاسکتا ہے پھر بھی اس کی مدد سے ہمیں اپنی بات کہنے میں نسبتاً آسانی ہوگی۔ اگر ہم اسے ایک کلیہ تسلیم ہی کرلیں تو ہمیں ابن صفی کی تحریروں میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ملتی ہے اور وہ پورے طور پر رولاں بارتھ کے نظریہ فن رائٹرلی تحریر کی کسوٹی پر کھرا اُترتا ہے لیکن ابن صفی کے خلاف سازشی افواہوں کے تدارک کے لیے شاید اتنا کہنا کافی نہیں ہوگا۔
اگر ادب انسانیت کی خدمت ہے تو ابن صفی نے یہ خدمت اپنی آخری سانس تک انجام دی ہے۔ اگر ادب خیر کی تبلیغ اور شر کی بیخ کنی کا نام ہے تو یہ بات شک کے دائرے سے باہر ہے کہ ابن صفی نے یہ فریضہ بطریق احسن انجام دیا ہے۔ اگر ادب قاری کو حقائق سے روبرو کرنے کو کہتے ہیں تو ابن صفی نے اپنے عہد اور آنے والے عہد کی سچائیوں کو عوام کے سامنے لانے کا قابل تحسین کام کیا ہے۔ اگر ادب نام ہے مناسب زبان میں اپنے مقاصد کی ترویج واشاعت کا، تو ابن صفی نے نہایت مناسب الفاظ میں اُن مقاصد کے لیے کام کیا ہے جو اس عالم فانی میں خیر کو بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ اگر ادب نام ہے انسان کے جذبۂ حیرت کو سیراب کرنے کا تو ابن صفی کی تحریر کی ایک ایک سطر اس کے لیے وقف رہی ہے۔ ان سب کا ثبوت چاہیے تو بلا انتخاب ابن صفی کے کسی بھی ناول کا مطالعہ کیجیے، عطر آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید کے مصداق آپ کو قدم قدم پر اُس کے ثبوت ملیں گے اور اگر یہ بھی ممکن نہیں ہو پائے تو کم از کم درج بالا اقتباسات کو ایک بار اور پڑھیے۔ آپ کو ایک ایک فقرے سے محسوس ہوگا کہ آپ کے مطالعے کا یہ سفر سرزمین ادب سے ہوکر گزر رہا ہے۔ ظاہر ہے ہماری تنقید نے ابن صفی کے ساتھ صریح ناانصافی کی ہے۔ اس کا تدارک ہم کو اور ہمارے عہد کے نقادان ادب کو کرنا ہے اور ہماری نسل اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے چکی ہے۔ اس لیے توی اُمید ہے کہ جلد ہی ابن صفی سے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ ہوجائے گا اور جلد ہی وہ آسمان ادب کا ایک روشن اور تابناک ستارہ ہوگا۔
(بشکریہ: ''ابن صفی: شخصیت اور فن کے آئینے میں'' مطبوعہ اردو اکادمی دہلی، 2014)

☆ ڈاکٹر یعقوب یاور (پ: 16 اکتوبر 1952)، معروف ادیب، ناقد، ناول نگار اور شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی کے سابق صدر ہیں۔ 1998 میں ان کا ناول 'دل من' شائع ہوا تھا۔ یہ ناول قدیم وادیٔ سندھ کی تہذیب وتمدن پر لکھا گیا ہے۔ ان کے دو ناول 'عزازیل' اور 'جہاد' بھی معروف ہوئے۔
موبائل نمبر: 09452828524

ابن صفی اور مذہب

ظفر اللہ خان بیدر (کرناٹک)

یہ بات کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ ایشیا کے عظیم جاسوسی ناول نگار محترم ابن صفی مرحوم فطرتاً ایک بااخلاق اور مذہبی آدمی تھے۔ یہ بات بھی بالکل صحیح ہے کہ ان کے مزاج وقلم میں طنز ومزاح کو زیادہ دخل تھا لیکن اس بات سے قطعی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے احساسات اور خیالات پر مذہب واخلاق نے اچھی خاصی چھاپ لگائی تھی۔

یہ بات بے حد غور طلب ہے کہ قلم کی ''بے حیائی'' کے اس پرفریب اور مذہب بیزار دور میں جبکہ اردو اور جاسوسی ناول نگاری کے نام پر بے شمار ''اہل قلم حضرات'' نے ایسی ایسی بے حیائیاں پھیلائیں کہ اس کے تصور ہی سے کراہیت ہوتی ہے۔ ابن صفی نے اس طوفان بدتمیزی کے درمیان قلم کی پاکیزہ اور آبرو اثر اقدروں کو نہ صرف نافذ کیا بلکہ انہیں حیات بھی بخشی۔ ابن صفی سے ہٹ کر کسی بھی جاسوسی ناول کو ہاتھ میں لے لیجئے اور چند ہی اوراق الٹ کر امتحان کر لیجیے کہ صاحب ناول نے کس قبیح انداز میں مذہب واخلاق کی مٹی پلید کی ہے۔

یہ سہرا تو صرف ابن صفی ہی کے سر جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے ناولوں اور اشعار میں مذہب واخلاق کی نہایت دیانت دارانہ پاسداری کی ہے۔ ان کا کوئی بھی ناول اٹھا لیجئے۔ شروع سے آخر تک پڑھ جایئے' کہیں بھی اخلاقی قدروں کو معدوم ہوتا ہوا نہیں پائیں گے۔ ناول نگاری کے دوران ایسے ایسے مقامات پر بھی ابن صفی کا قلم ملبوس اخلاق نظر آتا ہے' جہاں پہنچ کر دوسرے مصنفین بھٹک جاتے ہیں اور حقائق نگاری کی آڑ لے کر بے حجابی اور بداخلاقی کا دفتر کھول دیتے ہیں۔ ہاں البتہ ان مقامات سے گزرتے ہوئے ابن صفی نے جائز حد تک حالات وواقعات کی دیانتدارانہ رپورٹنگ ضرور کی ہے۔ اب چاہے معاملہ کسی کلب کا یا کسی شراب خانے ہی کا کیوں نہ ہو لیکن یہاں بھی اس احتیاط کے ساتھ کہ ارادتاً نفس کی مداخلت نہ ہو اور قلم بھٹکنے نہ پائے۔

یہ خوبی ابن صفی نے اول اول اپنے ابتدائی گھریلو ماحول ہی سے پائی تھی اور یہ چیز بہت کم ہی کسی کو ملتی ہے۔ ان کے واقعات لکھتے ہوئے ان کے بچپن کے ساتھی ڈاکٹر ابن سعید صاحب رقم طراز ہیں۔

''اسرار صاحب (ابن صفی کا اصل نام) نارے (یو۔پی) کے رہنے والے تھے اور کائستھ نژاد مسلم تھے اور بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ تم لوگ اتفاقی مسلمان ہو' ہم لوگ اختیاری مسلمان ہیں۔ ہمارے آباؤاجداد نے سوچ سمجھ کر اسلام قبول کیا۔''

آگے چل کر وہ ابن صفی کے ایمان دارانہ مزاج پر سے یوں نقاب اٹھاتے ہیں:

''محلے میں ان کی حیثیت 'امین' کی تھی لوگ اپنی امانتیں رکھواتے تھے اور لے جاتے تھے۔ ایک بار ایک صاحب نے ایک چھوٹا سا صندوقچہ رکھوایا۔ اس پر گرد جمی ہوئی تھی۔ میرے سامنے ہی واپس لینے آئے۔ اسی عالم میں ان کا صندوقچہ انہیں واپس ملا۔ میں نے کہا۔ ''گرد تو صاف کردی ہوتی'' بولے۔ ''غور ہی نہیں کیا...... پھر اگر ایک ذرہ بھی کم ہوتو وہ امانت میں خیانت ہے۔'' (روزنامہ سیاست' حیدرآباد۔ ۷ دسمبر ۱۹۸۰ء)

شاید یہی وجہ تھی کہ ابن صفی کے تمام تخلیقی سرمائے پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ کروڑوں صفحات پر پھیلے ہوئے ان کے جاسوسی لٹریچر میں ہمیں مذہب واخلاق پر مبنی بے شمار ایسی باتیں ملتی ہیں جن سے ابن صفی کی پاکیزہ ذہنی' مطہر نفسی اور حساس نظری کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے ایک دیرینہ رفیق محترم شکیل جمالی نے اپنے احساسات کا خراج اس طرح پیش کیا ہے۔

''ابن صفی صرف ایک بلند پایہ ادیب وشاعر ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک بہترین انسان' بہترین دوست اور انتہائی ذمے دار شریف اور وضع دار شخص تھے۔ ان کے ہونٹوں پر ہر وقت پھیلی ہوئی مسکراہٹ ان کے حسن اخلاق کا اعلان کرتی تھی۔ ابن صفی کے سینے میں ایک ایسا...... دھڑکتا ہوا دل تھا جو ہر شخص کے دکھ اور درد کو فوراً محسوس کرلیا کرتا تھا۔ نہ جانے کتنے نادار طالب علموں کو وظائف دیتے تھے اور نہ جانے کتنے مجبور و بے کس انسانوں کی مدد کرتے تھے۔''

(ناول آوارہ شہزادہ' کے نئے ایڈیشن کے ساتھ شائع شدہ ایک مضمون سے)

لوگ تو یہی سمجھتے ہیں کہ وہ ایک جاسوسی ناول نگار تھے۔ ان کا موضوع صرف چند جرائم کے خاتمے کی حد تک ہی تھا حالانکہ جرائم سے بھری ہوئی اس دنیا میں اعلیٰ معیارات اور عمدہ اقدار کا نفاذ کوئی معمولی بات نہیں۔ ابن صفی نے نہ صرف جاسوسی ناول نگاری کی بلکہ اس کے ذریعے جرائم کے بے شمار گوشوں کو بے نقاب کیا اور امن عامہ کے ضروری قیام کا عظیم تصور دیا' قانون کی بالادستی کو منوایا۔ سماج کے رگ وریشے میں پائی جانے والی مجرمانہ حرکات اور سازشوں کی نشاندہی کی' جہاں طنز ومزاح کے ذریعے لاکھوں مسائل کی حقیقت واضح کی' وہیں نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ اردو ادب کی عظمتوں کا کھلے بندوں اظہار کیا۔ بظاہر ناول تو جاسوسی ہی ہوا کرتے لیکن انسانی زندگی کے بے شمار پہلوؤں کو احاطہ کیے ہوئے۔ ادب' سماج' معاشرت' اخلاق' سیاست' نفسیات' علوم سائنس وٹیکنالوجی کا کون سا گوشہ ایسا ہوتا تھا جس کا تذکرہ ناولوں میں نہ ہوتا ہو۔ یہی نہیں بلکہ سائنسی کمالات اور فنی خوبیوں کی کوکھ سے پیدا ہونے والے شرمناک جرائم کا پردہ بھی چاک کیا اور احترام انسانیت کا درس بھی دیا' ساتھ ہی وطن کی آبرو کا پرچم

بلند کیا اور ملک وملت کی عظمت کا سکہ بٹھایا۔
''دلیر مجرم'' سے لے کر ''آخری آدمی'' تک ابن صفی نے سینکڑوں مستقل اور غیر مستقل کرداروں کا اپنے مخصوص انداز میں تعارف کرایا۔ انہیں پڑھتے ہوئے کبھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ ان میں سے کوئی ایک بھی ہماری دنیا کا نہیں۔ مستقل کرداروں میں فریدی' حمید' قاسم' انور' رشیدہ' عمران' صفدر' جولیا وغیرہ کو اس طرح پیش نہ کیا کہ یہ کردار کبھی کوئی گھٹیا اور بداخلاقانہ حرکات کے مرتکب ہوئے ہوں یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی قانون کی بالادستی کو منوانے کے لیے انہیں مصلحتاً حد سے گزرنا پڑا ہو یا طنز و مزاح کی سرحد سے گزرتے ہوئے صرف چھیڑ چھاڑ کی حد تک وسیع ہو گئے ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ کردار انتہائی پیچیدہ اور نازک موقف میں بھی برائی سے اجتناب کرتے نظر آئیں گے۔ جب بھی شراب اور کباب کی محفل میں گھرے ہوئے ملیں گے تو اس حالت میں کہ صرف ٹھنڈے پانی پر اکتفا کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ انتہائی بھوک و پیاس کی حالت میں بھی انہیں حرام وحلال کی تمیز باقی رہتی ہے اور اپنی خوراک حاصل کرنے کے لیے غلط اقدام سے گریز کرتے ہیں بلکہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے زیادہ سے زیادہ یہ کرتے ہیں کہ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ تک پہنچ کر کسی ایک کے گلے میں ایک آدھ بھیڑ کی قیمت باندھ دینے سے پہلے کوئی بھیڑ نہیں اٹھاتے۔ (شعلہ سیریز اور شہباز کا بسیرا) انہیں صرف مظلوموں سے ہمدردی ہوتی ہے۔ (کنول' روشنی' نیلم وغیرہ) جرائم کے خاتمے کے بعد جتنے سلطانی گواہ ملیں گے' وہ سب مظلوم رہے ہوں گے (مثلاً جوزف) ان کے ہاتھوں' ناحق پر کبھی زیادتی نہیں ہوتی۔
ابن صفی نے اگرچہ فریدی کو ایک مافوق الفطرت کردار بخشا ہے لیکن یہ وہ کردار ہے جسے خدا کے سوا کسی پر بھروسہ نہیں' اگر ہے تو اپنی زور بازو پر' ناکامیوں سے مایوس نہیں ہوتا۔ (خونی بگولے) خدا کے سوا' دنیا میں کسی کو بڑا تصور نہیں کرتا (موت کی آندھی) بری سوسائٹی سے گزرتے ہوئے بھی اپنے آپ کو آلودہ نہیں ہونے دیتا۔ حتیٰ کہ مصلحتاً بھی اسے اگر جوا کھیلنا پڑے تو جیتی ہوئی ساری رقم کا حساب کتاب رکھ کر' ہارے ہوؤں کو لوٹا دیتا ہے۔ (زہریلا سیارہ) دیر گئے گھر لوٹنے کے بعد کبھی نصیر یا دوسرے ملازمین کو نہیں جگاتا' کہ ان کی نیند اور آرام میں خلل ہوگا' خود ہی کھانا گرم کر کے کھا لیتا ہے۔ مزاج بڑا انقلابی پایا ہے۔ خود اسی کے الفاظ میں:۔
''حدود اللہ میں رہ کر میں یقیناً انقلابی ہوں۔ اللہ کبھی اس پر برہم نہیں ہو سکتا کہ کوئی قوم اپنے حالات کو مدنظر رکھ کر' اپنے وسائل کی تقسیم کا مناسب انتظام کرے۔'' (زہریلا سیارہ)
عمران کے کردار میں اگرچہ کھلنڈراپن اور حماقت بدرجہ اتم ملے گی لیکن اکثر و بیشتر یہی چیزیں فتحیابی کا سبب بن جاتی ہیں...... وہ ہزار لاابالی سہی' ماں باپ کے حق میں ایک فرماں بردار بیٹے سے کم نہیں

ہے...... پھر بھی خاندان کی محبت سے محروم ہے۔ قانون کی فرماں برداری میں ہزاروں مرتبہ موت کے منہ تک چلا گیا' کبھی کبھار قانون سے ہٹ کر بھی کچھ کر گزرے گا لیکن وہ بھی قانون ہی کے لیے ہوگا۔ اگر چہ یہ بے حد مکار ہے لیکن اس کی ساری مکاریاں صرف اور صرف دشمنوں اور مجرموں کو دھوکے میں رکھنے کے لیے یا زیادہ سے زیادہ مقصد براری کے لیے...... شراب وکباب کی دشوارترین سچویشن میں بھی ٹھنڈا پانی منتخب کرے گا...... یا نہیں تو پھر اپنے ہم چشموں کو بے خبر رکھنے کے لیے وسکی کی خالی بوتل کے ذریعے پانی پیے گا۔ (آتش دان کا بت) کسی بھی کام کو وقت پر انجام دینا اس کا پہلا اصول ہے۔ اس کا خیال ہے کہ...... "تیز رفتاری کے اس دور میں جو سوچنے کے لیے رکا' وہ مارا گیا۔" (کنگ چانگ سیریز)

حمید کے کردار میں عام طور پر لا اُبالی پن اور لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کا عنصر زیادہ ملے گا مگر صرف سطحی طور پر۔ یہ کبھی شراب کا رسیا بھی تھا مگر اس نے فریدی کی محبت میں رو کر اسے ترک کر دیا۔ کبھی اس نے ایسا موقع نہیں آنے دیا کہ جذبات کی رو میں بہ کر جنسی تسکین کے لیے کچھ کر گزرا ہو۔ اس گفتگو سے ابن صفی کی پاکیزہ قلمی کا تصور اور پختہ ہو جاتا ہے۔

"حمید اور فینی نے بمشکل ایک ہی روم میں رات بسر کی۔ حمید صبح دیر تک سوتا رہا۔ فینی اسے بڑی دیر سے جگا رہی تھی...... "نہیں' بس اب اٹھ جاؤ۔ مجھے وحشت ہو رہی ہے۔ ایسی بھی کیا نیند کہ میرا دھیان ہی نہیں۔"

حمید: تمہاری طرف سے دھیان ہی ہٹانے کے لیے تو میں نے خواب آور دوا کھائی تھی۔

فینی: کک...... کیا مطلب؟'

حمید: کبھی کبھی نفس کی درندگی کو اس طرح بھی دبانا پڑتا ہے۔

فینی: تم لوگوں کا (مسلمانوں) کا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ (زہریلا سیارہ)

صفدر' ان تمام کرداروں میں فریدی کے بعد ایک بے حد سنجیدہ فکر آدمی ہے۔ یہ کبھی شراب کا رسیا تھا لیکن اس نے اپنی شراب نوشی ترک کر دی ہے۔ عمران کے ماتحتوں کی مندرجہ ذیل گفتگو سے صفدر کی پاکیزہ خیالی کا خوب اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ ابن صفی کے قلم میں اصلاح کی کس قدر چستی ہے۔ (واضح رہے کہ نیمو عمران کا بالکل ہی نیا اسسٹنٹ ہے اور وہ پوری طرح اس کام کے لیے ابھی فٹ نہیں ہوا ہے) کہتا ہے۔

نیمو: تنہا پینے میں مزہ نہیں آتا' تم بیئر ہی لے لینا۔

صفدر: تم میری فکر نہ کرو۔

نیمو: کیا مصیبت ہے' آخر تم لوگ مولوی کیوں ہو گئے ہو؟

صفدر: اللہ کا حکم۔
نیمو: مت بور کرو۔
صفدر: اسی کو غنیمت جانو کہ تمہاری شراب نوشی پر اعتراض نہیں ہے۔
نیمو: بڑے ان کلچرڈ لوگ ہو۔
صفدر: شراب سے اجتناب تو ہمارے (مسلم) کلچر کا لازمی جز و تھا۔ مقصد یہ تھا کہ نیند کے علاوہ ایک لمحہ بھی بے خبری میں نہ گزرے۔
نیمو: اب اخلاقیات پر بور کرو گے؟
صفدر: بیزار ہو اخلاقیات سے؟
نیمو: حد سے زیادہ۔ صفدر: لیکن اگر تمہارے والد صاحب بھی اخلاقیات سے متنفر ہوتے تو تمہارے کاغذات میں ولدیت کا خانہ "نامعلوم" سے مزین نظر آتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہیں اخلاقیات طرہ امتیاز کیوں ہوتی ہے اور کہیں ایک فضول سی چیز کیوں بن جاتی ہے؟ نیمو: بس بس...... یہ موضوع ختم، کوئی اور بات کرو۔ صفدر: کبھی میں بھی پیتا تھا مگر اب توبہ کرلی ہے اور بتاؤں کیسے؟ ایک بار عمران صاحب نے سور کا گوشت سامنے رکھ دیا تھا، میں بگڑ گیا۔ وہ کہنے لگے "کیا حرج ہے، دونوں حرام ہیں۔ اگر وہ (شراب) سرور بخشتی ہے تو یہ (سور کا گوشت) بے حد لذیذ اور طاقت ور ہوتا ہے، ذرا چکھ کر تو دیکھو۔" بس اسی واقعے سے میں اتنا متاثر ہوا کہ شراب سے توبہ کرلی۔ (جونک اور ناگن) نیمو کے علاوہ چند اور بھی مستقل کردار شراب نوشی کرتے ہیں لیکن اکثر و بیشتر انہیں اس سے باز رکھنے کی تلقین کی جاتی ہے اگر ان کا یہ شوق کبھی حد سے بڑھ جاتا ہے تو انہیں عبرتناک سزا بھی دی جاتی ہے۔ (الفانسے) یہ ابن صفی ہی کا حق ہے کہ انہوں نے جاسوسی گلشن کی انتہائی سنگلاخ خشکیوں میں جہاں طنز و مزاح کی کلیاں چٹکائی ہیں، وہیں مذہب و اخلاق کے پھول کھلا کر وقتاً فوقتاً اس کی خوشبو سے سارے ناول کو معطر کر دیا ہے۔ ابن صفی کا ایک آفاقی سیاسی نقطہ نظر بھی ہے۔ اکثر و بیشتر ناولوں اور اشعار میں انہوں نے کمیونزم کی پول کھولی ہے۔ "قرآں میں ڈھونڈتے ہیں مساوات احمریں، یارو! نیا یہ فتنہ اغیار دیکھنا" (پاگلوں کی انجمن) اور سرمایہ داری کے بخیے بھی ادھیڑے ہیں۔ "اک دن جلال جبہ و دستار دیکھنا ارباب مکر و فن کو سردار دیکھنا (پاگلوں کی انجمن) اور واضح کیا ہے کہ انسان پر انسان کی حکومت کی بجائے خدا کی حکمرانی زیادہ بہتر اور موزوں ثابت ہوسکتی ہے۔ اس کے لیے محمد عربی کے اسوہ و افکار پر غور کرنے کی سفارش کرتے ہیں۔ "فرصت ملے جو لال حویلی کے درس سے اک بوریا نشیں کے بھی افکار دیکھنا (پاگلوں کی انجمن) دنیا بھر میں ہونے والے جرائم کے متعلق ان کا یہ خیال ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی اور محدود وسائل کے علی الرغم

اقتدار پر صرف چند ہاتھوں ہی کے قبضے نے دنیا میں بگاڑ کی بنیاد رکھی اور انسان اس سے تنگ آ کر جرم کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ مثلاً ڈائریکٹر اور فریدی کی اس گفت وشنید کو ملاحظہ فرمائیے۔ ڈائریکٹر: کرنل صاحب! آخر یہ جرائم اتنے کیوں بڑھ گئے ہیں؟ فریدی: جھلاہٹ کی بنا پر۔ ڈائریکٹر: میں نہیں سمجھا' جناب فریدی: آبادی بڑھ گئی ہے وسائل محدود ہیں اور چند ہاتھوں کا ان پر قبضہ ہے۔ دولت مندوں کو مزید دولت مند بننے کی آزادی ہے اور عوام کو قناعت پسندی کا سبق پڑھایا جاتا ہے۔ ڈائریکٹر: ایسی صورت میں اس کے علاوہ اور چارہ بھی کیا ہے۔ فریدی: چارہ ہی چارہ ہے۔ اگر خود غرضی اور جاہ پسندی سے منہ موڑ لیا جائے۔ ایک نئے انداز کی سرمایہ کاری کی بنیاد ڈالنے کی بجائے خلوص نیت سے وہی کیا جائے جو کہا جارہا ہے تو عوام کی جھلاہٹ رفع ہو جائے گی۔ ضرورت ہے کہ انہیں قناعت کا سبق پڑھانے کے بجائے ان کی ''خودی'' کو ابھارا جائے۔ جیسے بعض دوسرے ممالک میں ہوا ہے۔ پھر آگے چل کر ڈائریکٹر نے اپنے ان خیالات کا اظہار کیا۔ ''بات تو یہی ہے جناب ہماری تاریخ میں ایسے سربراہان مملکت بھی گزرے ہیں جو سر کے نیچے اینٹ رکھ کر' کھردرے فرش پر سویا کرتے تھے اور اپنے لیے محل نہیں بناتے تھے۔'' (زہریلا سیارہ) ابن صفی کے پاس اسلام سے بڑھ کر انسان کے دکھ درد کا کوئی اور صحیح مداوا ممکن نہیں ہے۔ انہوں نے اس رخ پر بھی اپنے ناولوں میں بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے اسلام کی نمائندگی وترجمانی کی ہے۔ ان کی نظر میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ ساری انسانیت کے لیے ایک بے مثال ماڈل ہے۔ انسانوں کو اگر ہر طرح کا چین وسکون اور آخروی نجات حاصل کرنا ہے تو...... رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کریں۔ اس کی ایک شاندار مثال انہوں نے اپنے ناول ''دشمنوں کا شہر'' میں پیش کی ہے۔ ابتدائی صفحات میں بتایا کہ نادر ایک کہنہ مشق پڑھا لکھا' جرائم پیشہ شخص تھا۔ ایک موقعے پر اسے اپنے ایک خطرناک دشمن سے انتقام کی سوجھتی ہے۔ اتفاقاً راستے میں...... ''سیرت النبیؐ'' کے ایک جلسے سے کسی واعظ کی یہ تقریر اس کے کانوں میں پہنچتی ہے۔ ''اور جب وہ فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے تو انہوں نے ان لوگوں سے انتقام نہیں لیا جو ان پر اوجھڑیاں پھینکتے تھے' ان کی راہ میں کانٹے بچھاتے تھے' ان پر پتھر پھینکتے تھے' ان تمام لوگوں کے لیے کھلی ہوئی معافی تھی' جنہوں نے انہیں ہجرت پر مجبور کیا تھا۔'' ان الفاظ کو سن کر نادر جیسا سنگدل انسان بھی پگھل گیا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کے بعد اس نے جرائم کی زندگی سے توبہ کی اور اپنے دشمن کو معاف کر کے گھر لوٹا۔ اس خصوص میں ہم یہی کہیں گے کہ ابن صفی کے پاکیزہ روحانی جذبے کو تولنا ہو تو اس ناول ''دشمنوں کا شہر'' کے پہلے باب کا مطالعہ بے انتہا مفید ہوگا۔ یہ بات اِدّعا کی حد تک صحیح ہے کہ اس طرح کی کوئی اور نظیر کوئی اور مصنف پیش نہیں کر سکتا...... یہ ابن صفی ہی کا حصہ ہے۔ ابن صفی کے نزدیک اسلام خدا کی مکمل بالادستی منوانا چاہتا ہے۔ جمہوریت میں ایسا

نہیں ہوتا' یہاں ایسا نہیں۔ ووٹوں کی اکثریت پر قانون بنایا جاتا ہے۔ بہترین صلاحیتیں' عمدہ صالحیت نظر انداز کر دی جاتی ہے۔ اسلام اور جمہوریت کے اسی فرق کو واضح کرتے ہوئے انہوں نے ایک خط کے جواب میں اس طرح لکھا تھا۔ "ایک بھائی نے پوچھا ہے کہ جمہوریت اچھی یا ڈکٹیٹر شپ اچھی؟ اور اسلامی مزاج اور ان دونوں میں سے کسے سہار سکتا ہے؟" "بھائی اگر آپ اسلامی نقطہ نظر سے پوچھتے ہیں تو پہلے بھی کبھی عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں جمہوریت جیسی کسی شے کی گنجائش نہیں۔ اسلام تو اللہ کی ڈکٹیٹر شپ کا نام ہے۔ جمہوریت میں دھارے کے ساتھ بہنا پڑتا ہے جبکہ سلام دھارے پر چڑھنے کو کہتے ہیں۔ اسلامی مملکت کے لیے صرف ایک ایماندار فرد کی حکومت کافی ہے کہ وہ ایمان دار فرد اپنے احکامات نہیں بلکہ قرآنی احکامات ہم سے منواتا ہے۔ لہٰذا میرے بھائی اسلام اور جمہوریت کو اجتماع ضدین سمجھیے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں جمہوری نظام پنپ نہیں سکا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔" پھر اس کے بعد جمہوریت کو تنقید کی کسوٹی پر رکھ کر' اس کی کمزوریوں کا یوں اعلان کرتے ہیں کہ حقیقت روشن ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ "پھر جمہوریت کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں ووٹ گنے جاتے ہیں۔ بقول اقبال "بندوں کو پرکھا نہیں جاتا' جو چاہے دولت کے بل بوتے پر بحیثیت امیدوار کھڑا ہو کر منتخب ہو جائے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ دفتر کی کلرکی کے لیے تو آپ کو فرسٹ کلاس گریجویٹ چاہیے۔ لیکن قوم کی باگ ڈور 'لٹھ' قسم کے افراد کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے۔ شیخ مرغی سپلائر انگوٹھا چھاپ تو قومی اسمبلی میں پہنچ کر قانون سازی فرمائیں اور سکنڈ کلاس گریجویٹ کو چپراسی بنانے کے لائق بھی نہ سمجھا جائے۔ ہے نا' سمجھ میں آنے والی بات......؟" (اداریہ' دوسرا پتھر' پاکستانی ایڈیشن) یہی نہیں' اس طرح کے ہزاروں خیالات کا ابن صفی نے ناولوں اور ناولوں کے اداریوں اور اپنے اشعار میں اظہار کر کے' قلم کی اسلامی قدروں کو اجاگر کیا ہے۔ ان کے خیالات کی یہ خوشبو' ان کے تمام لٹریچر پر پھیلی ہوئی ہے۔ اگر کوئی انہیں صرف ایک جاسوسی ناول نگار سمجھ کر نظر انداز کر جائے تو یہ اس کی کور چشمی ہو گی۔ ابن صفی کی شخصیت اور ناول نگاری اپنی گوناگوں اخلاقی خصوصیات کا بہر حال لوہا منوا لے گی۔ مستقبل کا مورخ...... اردو ادب میں ان کی تخلیقات کو "تعمیری ادب" کا باغ و بہار باب ضرور قرار دے گا جس کا حسین سنگ بنیاد' اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے رکھا تھا۔ کتنا اچھا ہو کہ "اردو کی اخلاقی قدریں' اقبال سے ابن صفی تک" کے زیر عنوان' اسی خوشبو کی تلاش کے لیے کوئی محقق اٹھ کھڑا ہو...... اور نظم و نثر کے تمام سرمائے سے اخلاقی اقدار کا سارا ذخیرہ نکال کر سامنے لے آئے۔

(نیا رخ ۱۱ اکتوبر ۱۹۸۸ء)

ابنِ صفی کی باتیں: سچ کو پہلے لفظ پھر لب دیں گے ہم

زمرد مغل

ایک عرصے تک ابنِ صفی کو پاپولر ادب کا خوشہ چین قرار دیا جاتا رہا اور اسی چیز کو lbssmall بنیاد بنا کر ادب کے تمام دروازے ان پر بند رکھے گئے۔ ابن صفی کی ادبی جلاوطنی کی داستان پر ایک ناول لکھا جا سکتا ہے جو ایک دلچسپ، حیرت انگیز اور سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے ادب کے تخلیقی پیمانوں پر بھی کھرا اتر سکے۔ ابنِ صفی کی ادبی جلاوطنی کی روداد بہت طویل ہے۔ مگر اس صبر آزما طویل سیاہ رات کے بعد جو سحر نمودار ہوئی، وہ بھی کم سحر انگیز نہیں ہے۔ ابنِ صفی کی جلاوطنی کے ختم ہوتے ہی واپسی کے سفر نے بھی بے اعتدالیوں کی ایک الگ طرح کی روایت قائم کی ہے، ابنِ صفی کو راتوں رات آسمانِ ادب کا نہ صرف درخشندہ ستارہ قرار دے دیا گیا بلکہ ان کی شان میں قصیدہ گوئی کی ایسی روایت قائم ہوئی ہے کہ شاید و باید، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ابنِ صفی کی جلاوطنی جس طرح ان کی تفہیم میں مددگار ثابت نہیں ہوئی ٹھیک اُسی طرح سے ابنِ صفی کی دن پھرتے ہی جس اندھی عقیدت کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے اُس سے بھی کوئی ٹھوس نتیجہ بر آمد ہونے والا نہیں۔ کسی بھی تخلیق کار کے کام کی سراہنا حد درجہ اعتدال کے ساتھ ہی اس کے کام کا جائزہ لے کر کی جا سکتی ہے۔

ہمارے جہاں دیدہ نقادوں نے جاسوسی، صحافتی اور مزاحیہ تحریروں کے ساتھ 'ادبی ٹیگ' لگانے کی شدید مخالفت کی ہے۔ تخلیقی عمل کی ان کے خود کے ہاں ہی کوئی متعین تعریف موجود نہیں ہے، بس جو سمجھ میں آیا یا جو منہ میں آیا بول دیا اور اسے ادب کو ماپنے کا پیمانہ قرار دیا گیا۔ جبکہ سامنے کی بات ہے کہ ادب وہ ہے جس میں تجربہ زیادہ سے زیادہ فیصد الفاظ کا روپ دھارنے میں کامیاب ہو جائے۔ اگر اس چیز کو پس منظر میں رکھ کر یا ذہن میں رکھ کر ابنِ صفی کے ناولوں کا مطالعہ کیا جائے تو وہ بحیثیت جاسوسی ناول نگار ہی اچھے ادب کے خالق قرار دیے جا سکتے ہیں، جبکہ ان کے ہاں مزاح کی بھرپور موجودگی بھی اپنے وجود کا احساس دلاتی ہے۔

ابنِ صفی کو خالص جاسوسی ناول نگار کی حیثیت سے بھی اگر پڑھا جائے تو میری ناقص رائے کی حد تک وہ ان ناول نگاروں سے کہیں آگے نکل جاتا ہے جو اخبار کے اشتہارات کا یا تھرڈ پیج پارٹیز کا اردو ترجمہ کر کے اور ان کے ساتھ "پیچھے مڑ کر دیکھا" یا "آگے بہت دور تک دیکھا" جیسے جملے لگا کر اُردو والوں سے اپنا لوہا منوانے میں کامیاب ہو گئے ہیں جبکہ ان کے سیکڑوں صفحات پر مشتمل ناولوں میں یا تو تجربہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے یا پھر تجربے کو الفاظ کا جامہ پہنانے میں ناول نگار کے ہاتھ میں صرف ناکامی آئی ہے۔ تقسیم ہند کے نام پر یا کسی دوسرے دکھڑے کا رونا رو کر کوئی تحریر سپردِ قلم کرنے سے بڑا

ادب وجود میں نہیں آسکتا، یہ بات گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ دو اور دو چار کی طرح صاف ہوگئی ہے۔ ابنِ صفی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کنڈیشنڈ ذہنیت سے اپنی تحریروں کو سپردِ قلم نہیں کرتے اور یہی چیز انہیں اردو کا بہترین ناول نگار بناتی ہے۔ ابنِ صفی چونکہ کنڈیشنڈ ذہن سے نہیں لکھتے، اسی لیے عمران جیسے عظیم اور لافانی کردار کو خلق کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ جو برے سے برے حالات میں اپنی حسِ مزاح سے کام لینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا۔ ابنِ صفی کا مزاح ''IndianGreatThe Loughter'' جیسا مزاح نہیں ہے جہاں راجو شریواستو یا احسان قریشی مائیک پر کھڑے ہوکر لطیفے سناتے ہیں اور نہ ہی ابنِ صفی کے ہاں وہ عامیانہ پن ہے جس میں کسی مشاعرے کی روداد کے بہانے اپنی بھڑاس نکالنے کے لیے ڈائس پر موجود کم ظرف شعراء ادب کو ذلیل کیا جاتا ہے۔ بلکہ ابنِ صفی کا مزاح اس وقت وجود میں آتا ہے جب حالات اس بات کا تقاضا کررہے ہوتے ہیں کہ انسان کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں، وہ حواس باختہ ہوجائے، یا ڈیپریشن کا شکار ہوجائے، جو ان کے کرداروں کی نفسیاتی صحت مندی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ابنِ صفی کو وقت اور حالات ''کنڈیشن'' نہیں کرسکے۔

دوسری اور اہم بات جو ابنِ صفی کو اُردو ادب کے لیے نہ صرف Relevant بناتی ہے بلکہ ابنِ صفی کے ناولوں کی قرأت کو مشرقی تہذیب کے قاری کے لیے لازم قرار دیتی ہے وہ ہے ابنِ صفی کا ''تہذیبوں کے تصادم'' کے پس منظر اور پیش منظر کو جزئی تفصیلات کے ساتھ اجاگر کرنا Samuel Huntington نے جو ''تہذیبوں کے تصادم'' کا نعرہ بلند کیا تھا وہ دیوانے کی بڑ نہیں تھا، بلکہ اس وقت دنیا کی دو بڑی تہذیبیں عالمی سطح پر ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں اور مغربی لکھنے والے اپنا کام خاموشی سے کررہے ہیں مگر مشرقی تہذیبوں نے اُس کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے میں جو آنا کانی کی ہے، اس کا خمیازہ اس کو بھگتنا پڑرہا ہے۔ ابنِ صفی وہ واحد ناول نگار ہے جس نے فرضِ کفایہ ادا کرتے ہوئے اس بلند ترین عمارت کی نیو رکھ دی ہے جس کی آخری منزل پر مشرقی تہذیب کے جھنڈے کو نصیب ہونا ہے۔ ابنِ صفی کے عظیم اور لافانی کردار ''عمران'' کا اگر بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ عمران جن مشکل ترین مہمات کو سر کرتا ہے، ان مہمات کو سر کرنے کے لیے عمران جن خصوصیات اور صفات کا استعمال کرتا ہے، اور مشکل سے مشکل سچویشن سے مکھن کے بال کی طرح نکل جاتا ہے وہ اس کا مارشل آرٹ کا ماہر ہونا ہے اور یہ مارشل آرٹ اس نے اپنے چینی استاذ سنگ ہی سے سیکھا ہے۔ اس مارشل آرٹ کا نام بھی ''سنگ آرٹ ہی ہے'' جو غالباً اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ اس آرٹ کا موجد ''سنگ ہی'' ہی ہے۔ یہاں پر جو باتیں قابلِ غور ہیں وہ یہ ہیں:

عمران کے لیے ابنِ صفی کا چینی استاذ کا انتخاب کرنا ابنِ صفی کی دور اندیشی پر دال ہے۔ وقت نے

ثابت کر دیا کہ "بائی پولر" دنیا سے روس کے زوال کے بعد "یونی پولر" دنیا جس کا سربراہ اور سرغنہ امریکہ تھا، نے بھی اپنا بوریا بستر سمیٹنا شروع کر دیا ہے۔ ظلم وستم کی جو داستان سقوطِ غرناطہ سے شروع ہوئی تھی اور جس نے اپنے عروج کے دن کولمبس کے امریکہ دریافت کرنے کے بعد دیکھے اور ظلم ستم سے تاریخ کے صفحات کو سیاہ کرنا جاری رکھا، اب افغانستان سے انخلا کے بعد وہ بستر مرگ پر ایڑھیاں رگڑنے میں مصروف ہے۔ اس وقت چین ہی دنیا کی ایسی بڑی طاقت ہے جس نے دنیا کی زمام کار سنبھال لی ہے۔ مشرقی تہذیبوں کو آئندگان کی منزلیں چین کی سربراہی میں ہی طے کرنی ہیں۔ ابنِ صفی نے جو نوشت دیوار پڑھا تھا وہ سچ ہو کر رہا۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ہمارے جو نقاد مغرب سے صرف وہی سامان نظریات کے نام پر اسمگل کرتے ہیں جو وہاں سو سال پہلے سے ہی اپنی معنویت اپنے ہی وطن میں کھو چکا ہو، جس کا کوئی پرسان حال خود اسی سرزمین پر نہ ہو جہاں اس کا طوطی بولتا رہا ہو، ایسے مغربی نظریات کو برآمد کر کے ہمارے ہاں، خاص طور پر اُردو ادیب لے آتے ہیں، آخری سانس لیتے ہوئے فرسودہ مغربی نظریات کو "وینٹی لیٹر" پر ادبی آکسیجن کی فراہمی کے ذریعے زندہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کو ابنِ صفی کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے گا یہ بات بعید از قیاس بھی ہے اور بعید از امکان بھی۔ کیونکہ ابن صفی براہِ راست "عہد حاضر" کے مغرب کو برآمد کرتے ہیں۔ ان کے ہاں تہذیبوں کی کشمکش کے وہ رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں جو عہد حاضر کا خاصہ ہیں، ان کے ہاں ہمیں وہ مغرب نظر آتا ہے جو ہمارا "ہم عصر" مغرب ہے۔ ابن صفی کی اہمیت کے اجاگر ہونے کے پیچھے بھی یہی راز کارفرما ہے کیونکہ ابنِ صفی کے وقت کے مغرب کو ایک زمانہ گزر گیا ہے۔ اور ہمارے دانشور "جبل گرددجبلت نہ گردد" کے مصداق اس وقت کے مغرب کی برآمدگی کے لیے راہیں ہموار کر رہے ہیں، ایسے میں انھیں ابن صفی کے عیوب بھی محاسن نظر آنے لگے ہیں۔

ابنِ صفی کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اس بات کو بھانپ لیا تھا کہ مغرب کا سیاسی زوال مغرب کے فکری غلبے اور تسلط کے سنگِ بنیاد کا کام کر رہا ہے۔ جنسی بے راہ روی کو سامنے کی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ابنِ صفی وہ واحد مصنف ہے جس نے مشرق کے اس خطے کو (جس میں ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش آتے ہیں) جنسی بے راہ روی سے محفوظ رکھنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ نہیں تو حال یہ تھا کہ بڑے بڑے شنکراچاریہ اور شیخ الحدیث لحاف اوڑھے اوباش، فحش، عریانیت سے بھرپور اور چھچھورے لٹریچر پڑھنے میں مصروف دکھائی دے جاتے تھے۔ ادیبوں کا حال تو یہ تھا کہ وہ ہم جنسیت کا شکار ہو کر رہ گئے تھے، تیسرے درجے کی فحش اور عریانیت سے بھرپور تخلیقات پر مضامین کے انبار لگائے جا رہے تھے، ایسے میں ابنِ صفی کا قارئین کا دھیان بالکل ایک دوسری سمت میں کھینچنا اتنا بڑا سیاسی، سماجی، ادبی اور

تہذیبی کارنامہ ہے جس کے لیے دفتروں کے دفتر بھی کم پڑتے دکھائی دیتے ہیں۔

ابنِ صفی نے کچھ دنوں تک اسرار ناروی کے نام سے شاعری بھی کی مگر اسرار ناروی نے جلد ہی اس بات کو محسوس کر لیا کہ اب وقت شاعری کرنے کا نہیں بلکہ اس میدانِ ادب سے کوڑا کرکٹ اور کباڑ ہٹانے کا وقت آ گیا ہے۔ اگر وہ شاعری ہی کرتے رہے تو اس عظیم مشن کو کبھی بھی پایۂ تکمیل تک پہنچایا نہیں جا سکے گا۔ لہٰذا انہوں نے فکشن کے میدان کا انتخاب کیا، کیونکہ اس وقت فکشن کے ہی راستے سے اخلاقی اقدار کا جنازے نکالنے کے لیے راہیں ہموار کی جا رہی تھیں، معیار سے گرے ہوئے، تہذیبی اقدار سے عاری، عریانیت اور فحاشی سے لیس تحریروں سے فکشن کے نام پر ادبی بازاروں میں گھما گہمی تھی، لیکن فحش و عریاں ادب کے علمبرداروں سے ان کے قارئین کی کثیر تعداد چھین لی اور انہیں ڈرائنگ رومز تک سمٹے رہنے پر مجبور کر دیا۔ ابنِ صفی پر" پاپولر ادب" تخلیق کرنے والوں کو اپنے اپنے گریبانوں میں بھی جھانک لینا چاہیے۔ ابنِ صفی نے ایسے قارئین کی ایک کثیر تعداد وقت کے نام نہاد بڑے تخلیق کاروں سے چھینی ہے، جن کی تربیت انہوں نے اپنے درجنوں ناولوں، سیکڑوں افسانوں سے کی تھی، کئی سال کی محنت سے تیار کی گئی قارئین کی اس نسل نے جب اپنے اپنے چہیتے ناول نگاروں، افسانہ نگاروں کو پیٹھ دکھا کر ابنِ صفی کے ناولوں کا انتظار بے چینی سے کرنا شروع کیا تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے میدان جنگ میں فوجیوں نے بغاوت کر دی ہو اور دشمن فوج سے جا ملے ہوں۔ اس لیے ابنِ صفی پر پاپولر ادب خلق کرنے کا الزام بھی دعویٰ بلا ثبوت کے ہی مترادف قرار پاتا ہے اور یہ ابنِ صفی کی تحریروں کی عظمت ہی ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی جیسا دیدہ ور نقاد عمر کی ایسی منزل میں، جب اعصاب جواب دے جاتے ہیں، ابنِ صفی کے ناولوں کے انگریزی تراجم کے لیے اپنے آپ کو وقف کرتا ہے۔ فاروقی صاحب نے ابنِ صفی کے چار ناولوں کا انگریزی ترجمہ کیا ہے۔ جن کے عناوین مندرجہ ذیل ہیں۔

WaterSmoke(1)

ArrowPoisoned(2)

DreadDoctor(3)

CorpseLaughingThe(4)

فاروقی صاحب اس بات کو بخوبی جانتے ہیں جس طرح سے خود انہوں نے ادبی من چلوں سے اُردو کی عزت و آبرو کی حفاظت کی ہے۔ ٹھیک اُسی طرح سے ابنِ صفی نے بھی اپنے ناولوں کے ذریعہ اردو ادب کو فحاشی کا اڈہ بنائے جانے کے ناپاک عزائم کو دھول چاٹنے پر مجبور کر کے اردو کی بے پناہ خدمت کی ہے۔ سچ بات تو یہ ہے شمس الرحمٰن فاروقی کا ابنِ صفی کے ناولوں کا ترجمہ کرنا ایک بڑے انسان کا دوسرے

بڑے انسان کے تئیں احترام محبت کے اس جذبے کا عکاس ہے، جس کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی تاریخ نامکمل رہے گی۔

ابنِ صفی نے یہ جان لیا تھا کہ مستقبل کی کمان عورت کے ہاتھوں میں جانے والی ہے۔ کیونکہ مرد نے غلبہ اور تسلط کے ہزاروں سال یہ ثابت کرنے میں لگا دیے ہیں کہ وہ نااہل ہے، عورت بے پناہ صلاحیتوں کی مالک ہے۔ اس کا احساس ابنِ صفی کو تھا، لیکن ابنِ صفی کوئی خطرہ مول لیے بغیر عورت کی صلاحیتوں کو لوہا منوانا چاہتے تھے، اسی لیے انہوں نے ویلن کے کردار میں عورت کو پیش کیا، ہیرو کے کردار میں پیش کرنے کی جرات نہیں کر پائے، اور ایسا شاید ابنِ صفی کے اندر کے بڑے تخلیق کار اور پاپولر لٹریچر کے خالق کے بیچ نفسیاتی کشمکش میں پاپولر لٹریچر کے خالق ابنِ صفی کی بڑے تخلیق کار ابنِ صفی پر برتری اور غلبہ کی وجہ سے ہوا ہے۔ مثلاً تھریسیا اور جولیا کے کرداروں میں ابنِ صفی نے عورت کو بے پناہ صلاحیتوں کی مالک کے طور پر متعارف کرایا ہے، مگر وہ عمران، حمید اور کرنل فریدی جیسا کوئی نسوانی کردار خلق نہیں کرتے غالباً جس کا سبب یہ ہے کہ وہ بھی SocietyDominantMale سے انحراف کی جرات نہیں کر پائے۔

(ابنِ صفی فین کلب اور فیس بک کے شکریہ کے ساتھ)

ابن صفی کی تحریروں کو غیر ادبی ماننا دیانت داری کے خلاف ہے

ڈاکٹر خالد جاوید

صاحب مضمون (اظہار اثر) نے ابن صفی کا ذکر سنجیدگی سے نہیں کیا ہے۔

ابن صفی بنیادی طور سے طنز و مزاح نگار نہیں تھے بلکہ شاعر تھے اور شاعری میں بھی ان کے پاس دراصل غزل کا فن تھا۔ ان کے ناولوں کی مقبولیت کا راز اسی نکتہ میں پنہاں ہے۔ ابن صفی کے پاس غزل والی زبان تھی۔ جاسوسی ناولوں میں ایسی ادبی چاشنی لکھنے والی صاف و شفاف زبان کا وجود ابن صفی کے علاوہ ناپید ہے۔ یہ سوال کہ ''جاسوسی ادب کو'' ادب میں شامل کیا جائے یا نہیں بالکل غیر ضروری ہے۔ یہاں ''یعقولبن'' کے اس قول کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ ''علم وادب کا موضوع ادب نہیں بلکہ ادبی چاشنی ہے جو کسی تخلیق کو ادبی تخلیق بناتی ہے۔'' اس نے یہ بھی کہا کہ ''ہم جس بات پر زور دے رہے ہیں وہ ادب کی تجدید نہیں ہے بلکہ جمالیاتی عمل کی خود مختاری ہے۔'' اگر Formalism کے اس نکتہ نظر کی روشنی میں ہم ابن صفی کو دیکھیں تو ابن صفی کی تحریریں اس قول پر پورا اُترتی ہیں۔ یہاں مکمل ادبی چاشنی بھی ہے اور جمالیاتی عمل کی خود مختاری بھی۔ ان کے جاسوسی ناول واقعات کے اعتبار سے اہم نہیں ہیں بلکہ کردار نگاری، منظر کشی، زبان و بیان اور اختصار (جو خالص غزل کے فن کا حصہ ہے) کی وجہ سے اہم ہے۔ کسی تخلیق کو بڑی تخلیق اس لیے بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بار بار پڑھی جاتی ہو۔ ابن صفی کو بھی ہم بار بار پڑھتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ کون سا ناول پڑھتے ہیں کیونکہ مستقل کردار ہونے کے ناطے اور صرف جاسوسی موضوع ہونے کے ناطے ابن صفی کے تمام ناول دراصل ایک تخلیق کے مختلف پڑاؤ کہے جاسکتے ہیں اس لیے ایک اعتراض جو اُن پر کیا جاتا ہے کہ آپ ابن صفی کی کوئی ایک ہی تخلیق بار بار نہیں پڑھ سکتے، بالکل بے بنیاد ہے۔ ان کی تخلیقات اس طرح ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں جیسے پریم چند کی ''گئودان'' اور ''نرملا''۔ اگر ہم ''گئودان'' کو بار بار پڑھتے ہیں تو ''گئودان'' بڑی تخلیق اور ''نرملا'' کو ایک بار پڑھ کر دوبارہ نہیں پڑھتے تو ''نرملا'' کمتر درجے کی۔ ابن صفی کے یہاں معاملہ یہ ہے کہ قاری چاہے ''پیاسا سمندر'' پڑھے یا ''جڑوں کی تلاش'' پڑھے، ''پاگل کتے'' پڑھے یا ''ڈیڑھ متوالے'' وہ دراصل ایک ہی تخلیق کو پڑھ رہا ہے۔ ابن صفی عمدہ طنز و مزاح نگار بھی تھے مگر ان کا طنز و مزاح پنچایتی مزاح نہ ہو کر انفرادی سطح کا مزاح تھا۔ شفیق الرحمٰن کے بعد غالباً وہ دوسرے مزاح نگار ہیں جہاں ایسے کردار پائے جاتے ہیں جو پڑھتے وقت تو قاری کو ہنساتے ہیں لیکن بعد میں سوچنے پر ان کے کرداروں کی پرتوں میں اُداسیوں کی جھلک بھی ملتی ہے۔ عمران کا کردار یا حمید کا کردار ایسا ہی ردعمل پیش کرتا ہے۔ ابن صفی نے دراصل طلسم

ہوشربا اور الف لیلہ جیسے عظیم کلاسیکی کارناموں کا Revival کیا ہے اور جدید دور میں ان کے ناول الف لیلہ سے کم مقبول نہیں ہوئے۔ جاسوسی ادب کا مقام سنجیدہ ادب یا ادب عالیہ میں کیا جائے یا نہیں سردست یہ میرا مسئلہ نہیں ہے مگر ابن صفی کی تحریروں کو غیر ادبی ماننا دیانت داری کے خلاف ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ابن صفی کے علاوہ اردو میں دوسرے تمام جاسوسی ناول نگار غیر ادبی لوگ ہیں اور ان کی تحریروں کو کسی بھی طور سے سنجیدہ ادب میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ صرف ابن صفی کو یہ فخر اور انفرادیت حاصل ہے اور یہ سب ان کی شگفتہ انداز تحریر، متوازن کانٹے کی تول جیسی نثر اور کردار نگاری کی وجہ سے ہے۔ ان کے یہاں دوسرے جاسوسی ناول نگاروں کی طرح ڈراؤنے واقعات، حد سے بڑھا ہوا سسپنس، تیز رفتار واقعات، مار کاٹ، سیکس اور فحش پن کا استعمال اور سطحی کردار نگاری جیسی کمزوریاں بالکل نہیں ہیں اور اسی لیے ان کا مقام اس صف میں نہیں ہے جہاں اکثر ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ابن صفی کے فن پر سنجیدگی سے کام کیا جائے اور انہیں محض جاسوسی ناول نگار سمجھ کر نظر انداز نہ کیا جائے۔

(ماہنامہ شاعر ممبئی، صفحہ 31، شمارہ نمبر 11، نومبر 1992، جلد 63)

☆ 585، صوفی ٹولہ، اولڈ سٹی بریلی (یوپی) سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر خالد جاوید کا ایک اہم مضمون ''ابن صفی: چند معروضات'' کے عنوان سے سہ ماہی اردو ادب، دہلی کے شمارہ اپریل تا جولائی 2006 میں شائع ہوا۔ زیر نظر تاثراتی خط انہوں نے ماہنامہ شاعر ممبئی کو ''اظہار اثر'' کے ایک مضمون ''اردو جاسوسی ادب: ایک جائزہ'' (ماہنامہ شاعر، شمارہ ۶، جلد ۳۶، ۱۹۹۲) کے جواب میں تحریر کیا تھا۔ طوالت کے خوف سے خط کا پہلا پیراگراف حذف کر دیا گیا ہے۔ البتہ ابن صفی سے متعلق باتیں آخر تک من و عن شائع کی گئی ہیں۔ اُس وقت خالد جاوید طالب علم تھے۔ فی الوقت جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے شعبہ اردو میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ (ع.ا.) موبائل: 09810596212

ابن صفی: بحیثیت ناول نگار

ڈاکٹر محمود حسن الٰہ آبادی

جاسوسی ناولوں کو صرف اردو ہی نہیں بلکہ مغربی زبانوں میں بھی تفریحی ادب سمجھا گیا ہے اس لیے اس صنف کو ادب میں کوئی مقام حاصل نہیں۔ لیکن یہ موضوع صاحبان قلم کے مزید غور وفکر کا محتاج ہے۔ اس کے بہت سے پہلو ہیں۔ جاسوسی ادب کیا تفریح حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ انشائیے، فکاہیات، مزاحیات، طنزیات، مضحکات، شکاریات اور سیاحات (اور کسی قدر سفرنامے)، یہ تمام اقسام تفریح سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی ضرورت قاری کو اس وقت ہوتی ہے جب وہ ٹھوس اور سنجیدہ موضوع سے اکتا جاتا ہے۔ بعض لوگ دماغی تکان دور کرنے کی خاطر خالی الذہن ہو کر صرف آنکھیں بند کر لینا کافی سمجھتے ہیں، لیکن جن کا ذوق مطالعہ اس سے آسودہ نہیں ہوتا وہ ذہنی تکان دور کرنے کے لیے ادب ہی کو ذریعہ بناتے ہیں۔ بطور مثال اس کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ کوئی شخص جب چلنے سے تھک جاتا ہے تو ہاتھ اور پاؤں دبوا لیتا ہے۔ اس علاج بالمثل سے اس کی تکان دور ہو جاتی ہے۔ جاسوسی ادب ایک ہلکا پھلکا لٹریچر ہے جو ذہنی تکان کو دور کرنے کے لیے امالہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اپنے اثر میں انشائیات، فکاہیات، طنزیات، مضحکات، شکاریات اور سیاحات سے کم نہیں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جاسوسی قصے بالعموم طویل ہوا کرتے ہیں جب کہ مذکورہ اصناف میں اکثر اختصار ہوتا ہے۔

داستان (fiction) کو ہر زبان میں ادب بزرگ (classics) کی صف میں جگہ دی گئی ہے۔ ہندوستان میں ناول نگاری کی عمر صرف ایک سو سال ہے۔ افسانوں کو بھی اسی صف میں شامل سمجھ لیجیے۔ ناولوں اور افسانوں کے دو مقاصد بالکل واضح ہیں، ایک تفریح دوسرے تعلیم۔ شروع شروع میں تعلیم بذریعہ تفریح بھی ہوا کرتی تھی جیسے حکایات گلستاں و بوستاں اور کلیلہ و دمنہ وغیرہ لیکن یورپی تنقید کی مختلف خصوصیات کا پرتو جیسے جیسے اردو پر پڑتا گیا اس کے مقصد میں وسعت پیدا ہوتی گئی اور آہستہ آہستہ ان سبھوں کو داستان (fiction) کے اجزا میں شمار کیا جانے لگا۔ ایک بحث یہ بھی شروع ہوئی کہ داستانوں کو افسانوں اور ناولوں کی صف میں رکھا جائے یا اس کو ایک خام ادب (crude literature) کی حیثیت دی جائے۔ جہاں تک ناچیز نے غور کیا ہے مولوی نذیر احمد اور منشی پریم چند سے پہلے کے جو قصے اردو زبان میں خواہ داستانوں اور قصوں کی شکل میں رہے ہوں جیسے طلسم ہوشربا، داستان امیر حمزہ، قصہ گل بکاؤلی، آرائش محفل اور فسانہ عجائب وغیرہ یا وہ اودھ پنچ کے لطائف و ظرائف یا فسانہ آزاد وغیرہ کی دلچسپ بیانیاں یا واقعات ہوں، ان سبھوں کو اگر بنیاد سے خارج کر دیا جائے تو تاریخ اردو کا تسلسل ٹوٹ

جائے گا۔ اس لیے ع: پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔

داستان اور ناول کے فرق پر گفتگو اس وقت چونکہ موضوع نہیں ہے اس لیے تکنیکی نکات سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف اتنے پر اکتفا ہے کہ خواہ وہ طویل اور مسلسل داستان رہے ہوں یا ان کا شمار قصوں میں کیا گیا ہو یا ظریفانہ ادبی مجادلات کا حصہ رہے ہوں، ان سب کی حیثیت دفع الوقتی اور قارئین کے لیے دلچسپی فراہم کرنے کی تھی۔ لیکن ان سبھوں کو ادب کی تاریخ میں ناولوں اور افسانوں کے پیش رو کی حیثیت سے تسلیم کرنا لازمی ہے۔ آخر مرثیوں اور محرم کی نقالی کو ڈرامہ کے اجزائے ترکیبی میں کیوں شمار کیا گیا ہے؟ واضح رہے کہ اردو ادب کی تاسیس سے لیکر فورٹ ولیم کالج کے زمانے تک داستانوں اور قصوں کا ایک جزو غالب سریت بھی تھا۔ یورپی زبانوں میں سریت کی جگہ اساطیر (mythology) نے لے رکھی تھی۔ جدید اصول تنقید میں افسانوں اور ناولوں کو بھی fiction ہی کہا گیا ہے جس کے معنوں میں غیر حقیقی، مصنوعی اور خلاف حقیقت اظہار بیان شامل ہے یعنی یہ fictitious ہوا کرتے ہیں؛ (fictitious کے معنی کے لیے دیکھیے لغت)۔ ناولوں اور افسانوں کے کردار بھی فرضی اور غیر حقیقی ہوا کرتے ہیں۔ اگر یہ کردار حقیقی ہوں تو انہیں سیرت میں شامل سمجھا جاتا ہے۔

جیسے جیسے مغربی اصول تنقید اردو میں رواج حاصل کرتا گیا فکشن کے اجزاء پر گفتگو ہونے لگی۔ یہ طے کیا گیا کہ قصہ کا کوئی موضوع ہونا چاہیے۔ شیخ سعدی نے گلستاں و بوستاں کی حکایات کو موضوع کے اعتبار سے ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ 'موضوع' سے وفاداری ہی انگریزی زبان کے 'پلاٹ' (plot) کے ہم معنی ہے جس کی رو سے پورا قصہ ایک موضوع کے تحت ترتیب دیا جاتا ہے۔ قصوں یا داستانوں میں جو افراد محور ہوا کرتے ہیں انہیں 'کردار' کا نام دیا گیا ہے۔ ان کی آپس کی گفتگو 'مکالمہ' کہلاتی ہے۔ پورے قصہ میں ظاہر اور غیر ظاہر کو 'منظر' اور 'پس منظر' کہا جاتا ہے۔ اسی کے پر اثر بیان کو 'منظر نگاری' کہتے ہیں۔ اگر اس کے کردار قاری کے ساتھ چلتے پھرتے نظر آئیں تو اسے 'پیکر تراشی' (imagery) سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جس زمانے یا ملک میں یہ قصہ پیش آیا ہو اس کے اظہار کو 'زمان' اور 'مکان' کی حیثیت دی جاتی ہے۔ جدید اسلوب تنقید نے جب ترقی کی تو قصہ کے ہر جزوی تفصیل میں منطقی ربط کی تلاش ہوئی۔ اسے 'جزئیات نگاری' سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

بیسویں صدی کا ربع ثانی ترقی پسندی سے عبارت ہے۔ ترقی پسندوں کی نظر میں چونکہ دنیا میں صرف دو طبقات ہیں 'بورژوا' اور 'پرولتاری' (مزدور اور کاشتکار) اس لیے ان کے تخلیق کردہ تمام ہی افسانے اور ناولیں انہی دو طبقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس طرح یہ کہنا درست ہے کہ انہوں نے ادب میں 'مقصد' کو جگہ دی۔ جدیدیت علائم سے عبارت اور مابعد جدیدیت رد تشکیل کے بعد تشکیل نو کی دعویدار ہے۔

ان میں سے اول میں مثبت اور منفی دونوں پہلو پائے جاتے ہیں لیکن ثانی الذکر مکمل طور سے ایک منفی فکر ہے جو صیہونیت کی کوکھ سے برآمد ہوئی ہے۔ اس صدی کی ابتدا میں مولانا حالی نے 'مقدمہ شعر و شاعری' لکھ کر جدید انداز تنقید کی بنا ڈالی جس پر کوئی شاندار عمارت تو اب تک تعمیر نہیں ہو سکی لیکن بہرحال اس بنیاد پر کچھ منزلوں کا ضرور اضافہ ہوا ہے۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی بنیاد پر شاعری اور افسانوں میں کچھ تخلیق اور تنقید دونوں ہوئی ہیں لیکن افسوس کہ اردو زبان کا موجودہ ذخیرہ ادب ان تمام انداز ہائے تنقید کا ناز اٹھانے کے قابل نہیں ہے۔

گفتگو fiction کے موضوع پر ہو رہی تھی جس میں ناچیز کے جائزے کے مطابق قدیم داستانیں اور فورٹ ولیم کالج کے زائیدہ اور تراشیدہ قصے بھی شامل ہیں۔ پریم چند اور نذیر احمد کے بعد قصوں کا روایتی انداز ختم ہو گیا اور بعد میں جو افسانے اور ناول منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے ان کی تاریخ کو چار ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) دور صالحیت: اس دور کے اہالیان قلم میں نذیر احمد، شرر، پریم چند، راشد الخیری اور دوسرے قصہ نگار شامل ہیں جن کا مقصد معاشرہ کو صالح اقدار سے روشناس کرانا تھا اور جن کا مقصد تعمیری تھا۔

(۲) ترقی پسندی کا دور: یہ دور دو ایسے عناصر میں کشمکش کا دور ہے جسے ایک مخصوص معاشی فلسفہ نے باہم دست و گریباں کر دیا تھا۔ حالانکہ اس مسئلہ کے دیگر حل بھی موجود تھے۔ سوویٹ عناصر کی مخالفت میں آزاد معیشت کے نمائندے (بالخصوص گوپال متل اور ان کا ماہانہ ترجمان 'تحریک') بھی موجود تھے۔ لیکن کشمکش کے ساتھ ہی اس دور کی تخلیقات میں ایک مقصد موجود رہا ہے۔ اسی دور میں ڈارون، فرائڈ، والتیر، روسو اور مالتھس کے فلسفوں کے ذریعے ادب میں اباحیت اور انسانیت شکن عناصر کی ایسی گرم بازاری ہوئی کہ رشید احمد صدیقی اور اکبر الہ آبادی جیسے نثر نگاروں اور شاعروں کو اس کے خلاف صف آرا ہونا پڑا۔

(۳) دور جدیدیت: اس میں قدروں کی اہمیت نہیں رہ گئی فکر قدیم ہی کو نئی علامتوں سے روشناس کرا کے صالح اور غیر صالح دونوں کو یکجا کر دیا گیا۔ لیکن اظہار حقیقت کے اس پردہ میں تعمیر کے عناصر کم پائے جاتے ہیں۔ مغربی فلسفوں کے زیر اثر آزادہ روی اور اباحیت پسندی ان کے اظہار بیان پر غالب رہی ہے۔

(۴) مابعد جدیدیت: یہ ایک منفی تحریک ہے جس پر دجالی نظام اپنے ہلاکت خیز نظام کی تعمیر کرنا چاہ رہا ہے۔ اس تحریک پر مختلف گوشوں سے مختلف انداز کے تبصرے ہوئے ہیں لیکن مقالہ کے عنوان کے تحت اسے نظر انداز کر دینا ہی مناسب ہے۔

ادب کی مثال ایک تناور درخت کی ہے۔ اس کی جڑیں گہرائی میں اور دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس

کا تنا مضبوط ہے اور موسم بہار کی حالت میں اب اس کی شاخیں، پتے، پھل اور پھول قارئین کے لیے دعوت نگاہ ہیں۔ لیکن ایک نقاد صرف بالائی شان و شوکت میں محو ہو کر اس کی اصل کو فراموش نہیں کر سکتا۔ اردو تاریخ ادب کا تجزیہ کرنے سے جو چیز ناچیز کے فہم میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ ہم قدیم داستانوں، لکھنؤ کے ادبی مجادلات، معاشرتی، اصلاحی اور تاریخی ناولوں کو نظر انداز کر کے 'آگ کا دریا' اور 'کئی چاند تھے سر آسماں' تک نہیں پہنچ سکتے۔ ان تمام تخلیقات کو اگر یکجا کر کے ان کا تجزیہ کیا جائے اور اس تجزیے پر ابن صفی کی نگارشات کو منطبق کیا جائے تو کسی بھی مرحلے میں انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ابن صفی کی سرّیت پسندی پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔ سر دست ہم جدید اصول تنقید کی رو سے ناولوں کے اجزائے ترکیبی کے تحت ابن صفی کی ناولوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنا کافی سمجھتے ہیں۔ ہم نے ناول نگاری میں پلاٹ، کردار، مکالموں، زمان و مکان اور جزئیات نگاری کی ترتیب قائم کی ہے۔ اس لیے اسی ترتیب سے موصوف (مرحوم) کی ناولوں کا جائزہ لیا جائے گا۔

ابن صفی کے ڈھائی سو سے زیادہ جاسوسی اور چند دیگر ناولوں میں کوئی بھی ناول ایسا نہیں جس میں مستحکم پلاٹ نہ ہو۔ موجودہ ناول نگاری کا جو رجحان ہے اس میں مقصد کو فراموش کر دیا گیا ہے۔ ابن صفی نے ناول نگاری ایک مقصد کے تحت شروع کی یعنی قانون کا احترام اور فحش سے اجتناب۔ میں مثالوں سے اس مضمون کو گرانبار نہیں کرنا چاہتا۔ ابن صفی کے قارئین اس بات سے بخوبی واقف ہیں۔ ویسے بھی میں ابن صفی کے تمام ناول پڑھنے کی مسرت حاصل نہیں کر سکا۔ مزید یہ کہ نسیان کی وجہ سے پڑھے ہوئے مواد کا ایک دھندلا سا ہی خاکہ ذہن میں موجود ہے اس لیے قطعیت کے ساتھ مثالیں دینا فی الوقت میرے لیے آسان نہیں ہے۔ پھر بھی یہ بات تو یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ابن صفی کے کسی ناول میں پلاٹ کی کوئی کمزوری نہیں ہے۔ پورا قصہ ایک منطقی ترتیب سے آگے بڑھتا ہے۔ مجرموں اور قانون کے رکھوالوں کی جنگ شروع سے آخر تک جاری رہتی ہے۔ پہلے جن حادثات کے وقوع سے قصہ کی ابتدا ہوتی ہے وہ ایک منطقی رفتار سے اپنے ارتفاع (climax) تک پہنچتا ہے جہاں قانون کی جرم پر فتح ہوتی ہے۔ آپ ادب لطیف کے نمائندہ طویل سے طویل ناول پڑھ جایئے ان میں کیا یہی تدریج نہیں ہے؟

ابن صفی کا مزاج شاعرانہ ہے اور جس طرح وہبی شاعروں پر شعر کا الہام ہوا کرتا ہے اور انہیں اس سلسلہ میں کوئی کاوش نہیں کرنی پڑتی، ابن صفی بھی نہایت سہولت سے اپنے قصے کو مقامی، ملکی یا بین الاقوامی پس منظر میں سرگرم سفر رکھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کی ان کے اوپر بارش ہو رہی ہے۔ ابن صفی کے بارے میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ وہ ایک نہایت حساس انسان تھے۔ ان کی نظروں کے سامنے ہندوستان کی تقسیم ہوئی اور پاکستان دولخت ہوا۔ دوسری جنگ کا پورا نقشہ انہوں نے ملاحظہ فرمایا اور امن

کے نام پر اسرائیل جیسے ایک ناجائز نام نہاد ملک کا وجود ہوا۔ وہ ظلم کی ہولناکیوں، جنگ کی تباہ کاریوں، اخلاق کے زوال اور معاشرہ کے فساد سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ ان کے ناولوں کے پلاٹ کا تانا بانا انہی ناہمواریوں کے ریشوں (fibers) سے بنا گیا تھا۔ یہ سب زندگی کے حقائق تھے۔ اسی لیے ان کے یہاں فساد اور شر کے تمام اجزاء بیک وقت پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس شر کی گرم بازاری میں خیر بھی اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ اور اللہ کی اس سنت کے تحت کہ شر کو بالآخر فنا ہونا ہے اور خیر کو باقی رہنا ہے خیر کی فتح پر قصہ کا اختتام ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف عصر حاضر کے دیگر ناول نگاروں کے یہاں اول تو خیر و شر کی معرکہ آرائی کا کوئی وجود نہیں ہے اور اگر کہیں اس کے کچھ اجزاء پائے جاتے ہیں تو صرف برائے نام۔ ابن صفی اس معاملہ میں اپنے تمام معاصرین سے برتر ہیں۔

ابن صفی کے تمام کرداروں (characters) کا ایک کردار (discipline) ہے۔ ان کے کچھ کردار مستقل ہیں اور کچھ بعض ناولوں میں بدلتے رہتے ہیں۔ مستقل کرداروں میں فریدی، حمید، قاسم، انور، رشیدہ، آصف، ریکھا، عمران، بلیک زیرو، صفدر، جولیا، خاور، نعمانی، تنویر، ظفرالملک، جیمسن اور استاد محبوب نرالے عالم وغیرہ ہیں۔ ان میں سے ہر کردار کا اپنا مزاج اور الگ کیرکٹر ہے۔ کسی بھی ناول یا ناول کے کسی بھی حصے میں وہ اپنی مخصوص صفات سے دست بردار نہیں ہوتا۔ ہر کردار اپنے پیشہ میں مخلص (dedicated) ہے۔ کسی کو بھی اس کے مزاج اور طبیعت کے خلاف کام کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

جہاں تک فریدی کا تعلق ہے وہ ابن صفی ہی کا نہیں بلکہ تقریباً نصف قارئین کا آئیڈیل (ideal) ہے لیکن عمران کی دہری شخصیت نصف سے زیادہ قارئین کے لیے مسحور کن ہے۔ فریدی جہاں اپنے کیرکٹر کی صلابت کی وجہ سے اپنے مقام سے کہیں بھی فروتر نہیں ثابت ہوتا، عمران حسب موقع رنگ بدلتا رہتا ہے لیکن اس کی حماقت کے پردے میں ملفوف ظرافت کہیں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ ابن صفی نے عریانی اور فحش نگاری جو رومانی ناولوں کے نقطۂ عروج کے طور پر سامنے آئی تھی، کے خلاف اپنی مہم شروع کی تھی اس لیے عفت اور پاکبازی میں اس کے یہ دونوں ہیرو مثالی ہیں۔ لیکن بے حیائی اور عریانیت کے مظاہر سے اجتناب اس کے تمام ہی کرداروں کی قدر مشترک ہے۔ ان میں سے جو کردار کچھ عاشقانہ (اسے آج کل رومانٹک کہا جاتا ہے) مزاج رکھتے ہیں ان کا کردار بھی فسق کی حد کو نہیں پہنچتا۔ صرف تنویر واحد کردار ہے جو حد سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کی اسے بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ سنگ ہی جیسے اوباش اور آبرو باختہ مجرم کے مقابلہ میں بطور امالہ ابن صفی نے اسی طبقہ سے تھریسیا؟ نہیں— نیچ جیسا دلیر villain پیدا کیا ہے جو بے حیائی اور اوباشی کا سخت مخالف ہے۔ صفدر جنگ جیسا ٹیڈی نواب بھی جب نینا کو عمران کی طرف مائل دیکھتا ہے تو رشتہ کے لیے سلسلہ جنبانی کی بات کرتا ہے۔ حد

درجہ مغربیت کے باوجود وہ بے حیائی کی ترغیب نہیں دیتا۔ غرض کہ ابن صفی کے کسی بھی کردار میں دورنگی کا کہیں گزر نہیں ہے۔

ناولوں میں کردار انتہائی اہمیت کا حامل ہوتا ہے کسی بھی ناول کی کامیابی میں کرداروں کی پختگی کا نصف سے زیادہ دخل ہوتا ہے۔ ابن صفی کی کامیابی یہ ہے کہ ان کے زائد از دوصد ونصف ناولوں میں پچاسوں کردار ہیں لیکن ہر کردار ایک خاص مزاج اور طبیعت کا مالک ہے اور وہ کردار جب بھی کسی ناول میں پیش ہوتا ہے اپنے مزاج اور طبیعت کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا۔ فریدی اور عمران کو چھوڑ دیجیے۔ حمید اور قاسم کو لے لیجیے، قاسم حمید کا آلہ کار ہونے کے باوجود اپنی حماقتوں سے قارئین کے لیے ہمیشہ تفریح ہی نہیں مہیا کرتا بلکہ جب غصے میں ہوتا ہے تو حمید کے بھی دیوتا کوچ کر جاتے ہیں۔ اپنی بیوی کا شاکی ہونے کے باوجود اس کی غیرت کا یہ عالم ہے کہ کسی غیر مرد سے لفظی اور محاوراتی نسبت (جیسے آپا کے ساتھ 'جان' کا لاحقہ) بھی اسے برداشت نہیں ہے۔ ریکھا کا کردار جولیا کے مقابلہ میں کچھ دبا ہوا ہے کیونکہ فریدی عمران کے مقابلہ میں زیادہ سنجیدہ اور محتاط ہے۔ جولیا اور عمران کے مقابلہ میں ریکھا اور فریدی کی یکجائی بہت کم ہوتی ہے لیکن اپنے افسر (boss) سے دونوں کا جذباتی لگاؤ یکساں درجہ کا ہے۔ انور اور رشیدہ ہمیشہ لڑتے جھگڑتے لیکن ملتے اور ساتھ رہتے دکھائی دیں گے۔

ظرافت کے جتنے بھی سرچشمے ہیں وہ کبھی خشک نہیں ہوتے۔ حماقت آمیز ظرافت یا ظرافت آمیز حماقت عمران کے کردار میں خلقی طور سے ودیعت ہوئی ہے۔ اسی لیے وہ تنہائی میں بھی حماقتوں کا مرتکب ہوتا رہتا ہے۔ سلیمان اور جوزف دونوں اس سے بے تکلف ہیں لیکن دونوں کے انداز میں یہ فرق ہے کہ جوزف کا انداز فدویانہ اور سلیمان کا بے تکلفانہ ہے اور یہ فرق ہر جگہ نظر آئے گا۔ انسپکٹر آصف اپنی بزرگی کے باوجود ہمیشہ ہی ناکام ہے یہی حال تقریباً فیاض کا ہے لیکن چونکہ فیاض اپنی ناکامی اور خفت کا داغ مٹانے کے لیے عمران ہی کا سہارا لیتا ہے اس لیے عمران کا تعاون اس کے لیے کبھی کبھی ترقی درجات کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ فیاض کے برخلاف چونکہ آصف کو اپنی بزرگی کا غرور ہے اس لیے ناکامی ہمیشہ اس کا مقدر ہوتی ہے۔ غرض کہ جہاں تک کردار نگاری کا سوال ہے ابن صفی کے یہاں کوئی جھول یا کمزوری نہیں پائی جاتی۔

ناول نگاری کی ایک صفت مکالمہ نگاری ہے۔ مکالمہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ کوئی کردار کبھی اپنی تردید کرتا ہوا نظر نہ آئے۔ گفتار میں اگر کسی سابق گفتگو کا یا عمل کا حوالہ ہو تو اس میں کذب بیانی کا دخل ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ دراصل مکالمات کا کرداروں سے تعلق ناخن اور گوشت کا ہے، مکالمہ نگاری کو کردار سازی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کردار میں پختگی ہوگی تو ان کے مکالمات میں نہ تصنع اور آورد ہوگا نہ ہی کبھی

کذب بیانی یا خود تضادی کا ان سے صدور ہوگا۔ ابن صفی کے ناولوں کی کامیابی دراصل نصف سے زیادہ اس کے مکالموں ہی کی رہین منت ہے۔ یہ مکالمے ایسے برجستہ اور مبنی برحقیقت ہوتے ہیں کہ قاری اگر اس میں کوئی پیچ نکالنا چاہے تو بھی نہیں نکال سکتا۔

قلم کی قوت کا ایک راز اس کی منظر نگاری میں پنہاں ہے۔ مرزا دبیر پر میر انیس کی فوقیت کا سبب انیس کی سلاست اور منظر نگاری کو سمجھا گیا ہے۔ ابن صفی اس میدان کے اگر شہسوار نہیں تو بھی کسی ناول نگار سے پیچھے نہیں ہیں۔ جذبات نگاری اور منظر نگاری ان کی تحریروں کا ایک طرہ امتیاز ہے۔ چونکہ وہ خود شاعر ہیں اس لیے منظر نگاری میں جزئیات سے صرف نظر نہیں کرتے۔ اہل ذوق قاری کو ان کے ہر ناول میں ایسے مناظر بکھرے نظر آئیں گے جہاں وہ کھو جانے کی حد تک محو ہوسکتا ہے۔

آخر میں ہم ناول نگاری کے اصل سبب یعنی مقصد کو لیتے ہیں۔ اس ذیل میں آج کل رومانی ناولیں مایوس کن حد تک بے سمتی کا شکار ہیں۔ دراصل یہ ناولیں صرف دفع الوقتی یا لایعنیت (absurdity) پر مبنی ہیں۔ ان سے absurd ڈراموں کی طرح جذباتی تسکین کا سامان تو فراہم ہوتا ہے لیکن کسی مقصد کی طرف رہنمائی نہیں ہوتی۔ تعجب تو یہ ہے کہ انہی ڈراموں یا افسانوں کو ادب میں اعلیٰ مقام دیا گیا ہے۔ تاریخ تنقید کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تاریخی ناولوں کو رومانی اور جذباتی ناولوں کے برابر کبھی نہیں سمجھا گیا حالانکہ اعلیٰ پایہ کے تاریخی ناولوں میں منظر نگاری اور جزئیات نگاری کی کمی نہیں پائی جاتی۔ ان کی زبان بھی ادب کا شاہکار ہے۔ پرانے تاریخی ناولوں میں عبدالحلیم شرر اور نئے تاریخی ناول نگاروں میں نسیم حجازی کو بڑے سے بڑے ناول نگاروں کے روبرو رکھا جاسکتا ہے۔ تاریخی ناولوں میں دو طرح کے کردار ہوتے ہیں، ایک تاریخی دوسرے افسانوی۔ تاریخی کردار تاریخی حقیقت کے ترجمان ہوتے ہیں۔ اگر تاریخ میں کتر بیونت کی گئی تو ناول کی ثقاہت مجروح ہوتی ہے۔ افسانوی کردار دراصل ناول میں دلچسپی کی خاطر یا زیب داستان کے لیے وضع کیے جاتے ہیں جن کا تاریخ سے تو براہ راست واسطہ نہیں ہوتا لیکن تاریخی واقعات سے ان کا تعلق بہت مربوط ہوتا ہے۔ تاریخی ناولوں کی غرض وغایت یہ ہوتی ہے کہ اگر وہ فتح اور اشاعت اسلام کے مبشر ہوں تو جذبات میں تلاطم پیدا ہو، تا کہ وہی ایمانی قوت ایک قاری کے اندر پیدا کی جاسکے جو صدر اسلام میں پائی جاتی تھی۔ اس قسم کے ناول اسلام کے دور اول کے عکاس ہوتے ہیں۔ اگر ان ناولوں میں مصائب اور شکست کی عکاسی ہو تو اس کا مقصد ان اسباب کا تدارک کرنا ہوتا ہے جو موجودہ دور زوال میں مسلمانوں کی شکست کا باعث ہوئے ہیں۔ نسیم حجازی کے یہاں دونوں قسم کے ناول پائے جاتے ہیں۔ ان کے کئی ناول ہندوستان، شرق اوسط اور ہسپانیہ میں مسلمانوں کے عروج وزوال سے متعلق ہیں۔ شاعری میں مسلمانوں کے عروج وزوال کا نقشہ

ہمیں حالی کی مسدس 'مدوجزر اسلام' میں ملتا ہے۔ تاریخی جزئیات کے بیان میں ہم حفیظ جالندھری کے 'شاہنامہ اسلام' اور قیصر الجعفری کی منظوم سیرت 'چراغ حرا' کو پیش کرسکتے ہیں جن میں اصل مراجع سے استناد کیا گیا ہے۔ مقصد ان کا یہی ہے کہ مسلمانوں میں پھر وہی اسلامی قوت اور جذبات کی حرارت پیدا ہو جائے جس نے اسلام کو چار دانگ عالم میں وسعت دینے کا حیران کن فریضہ انجام دیا ہے۔ ابن صفی کے ناول بھی ایک متعین مقصد کو لے کر ایک مشن کی تکمیل کرتے ہیں جس کا اظہار مصنف نے خود کئی مواقع پر کیا ہے۔ فحش نگاری کے خلاف لکھنے کے لیے انہوں نے قانون کی بالادستی کو اپنا موضوع تحریر بنایا ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں ابن صفی کے موضوع پر منعقدہ ایک سیمینار میں جب الٰہ آباد ہی کے ایک معروف نقاد نے ابن صفی کے یہاں مقصدیت کے وجود کی نفی کی تو ان پر چاروں طرف سے اعتراضات کی بوچھار ہوئی جس کا فاضل مقالہ نگار کوئی جواب نہیں دے سکے۔

ابن صفی صرف عریاں اور فحش نویسی کے خلاف نہیں تھے بلکہ انہوں نے اعلیٰ اخلاقی قدروں کی ہر ممکن حمایت کی ہے۔ مخفی نہ رہے کہ انسانی اخلاقی قدروں کا مذہب اور خصوصیت سے اسلام میں بہت اعلیٰ مقام ہے۔ انہوں نے اسلام کی تبلیغ تو نہیں کی لیکن ان کی بعض تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ 'حکومت الٰہیہ' کے نہ صرف قائل تھے بلکہ دنیا کی تمام خرابیوں اور ناانصافیوں کا اسے حل بھی سمجھتے تھے۔ اللہ کی حاکمیت کے علاوہ کالی کملی والے کی غلامی پر بھی وہ نازاں تھے۔ اسلام کے کٹر سے کٹر مخالفین تک کو اس بات کا اعتراف ہے کہ اخلاقی قدروں کا جو نمونہ اسلام نے پیش کیا ہے اس کی ہمسری دوسرا کوئی نظام اخلاق نہیں کرسکتا۔ تفریحی ناولوں میں ایک بلند اخلاقی معیار پیش کرنا، فحاشی اور بدکرداری سے اجتناب اور قانون کی پاسداری کو مقصد بنالینا، وہ حقیقت ہے جو ناولوں کی دنیا میں ابن صفی کو ایک اعلیٰ مقام دینے کے لیے مجبور ہے۔ ایک مغربی نقاد نے مصنف کے کرداروں کی پاک دامنی کی وجہ سے ابن صفی کو مغربی جاسوسی ناول نگاروں پر فوقیت دی ہے۔

یہ تو وہ خصوصیات تھیں جو ابن صفی کو ناول (صرف جاسوسی نہیں) نگاروں میں بلند مقام پر فائز کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اگر ہم رومانیات، فکاہیات، شکاریات اور سیاحات کو ادب گردانتے ہیں تو کیا ناول نگاری کے لیے جاسوسی یا سریت ایک قدر معکوس ہے جو ابن صفی کو اس زمرے سے خارج کردے گی؟ پاکستان میں ابن صفی کی قدردانی ہوئی ہے۔ انگریزی زبان میں جاسوسی ادب کی تاجدار اگاتھا کرسٹی نے ابن صفی کی خلاقیت کا اعتراف کیا ہے۔ جرمنی کی کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ اور مشرق وسطیٰ کے ایڈورڈ سعید جیسے اہل زبان اور قد آور نقادوں نے ابن صفی کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ پروفیسر فین تھیسن (ناروے) اپنے ناولوں میں مزاح اور سسپنس کو یکجا کرنے کی وجہ سے ابن صفی کو اگاتھا کرسٹی پر فوقیت دیتے ہیں۔

ابن صفی کی خلاقانہ صلاحیتوں کا اعتراف اب بین الاقوامی بن چکا ہے۔

ابن صفی کی مزاح اور طنز نگاری بھی مسلّم ہے۔ مجتبیٰ حسین حالات سے مزاح کا عنصر پیدا کرتے ہیں۔ یہی حال پطرس بخاری کا ہے۔ رشید احمد صدیقی اپنی عالمانہ زبان میں مزاح اور طنز دونوں کو یکجا کر دیتے ہیں۔ اکبرالٰہ آبادی اور مشتاق یوسفی ظاہر کو اپنے حق میں کرنے کے لیے زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ دونوں حضرات الفاظ، جملوں، محاوروں اور اشعار کا استحصال بھی کرتے ہیں۔ ابن انشا، انشائے لطیف سے مزاح پیدا کر لیتے ہیں۔ ابن صفی کے بعض کردار اپنے مکالموں میں ایسے بے تکلف جملے ادا کرتے ہیں جن میں حالات حاضرہ اور مختلف پیشہ ور حضرات کے رویوں پر طنز ہوتا ہے۔ ان کے کئی کردار اپنی ذات میں خود مضحک ہیں جیسے قاسم، استاد محبوب نرالے عالم اور علی عمران ایم۔ ایس سی؛ ڈی۔ ایس سی (آکسن) جو اپنے کو بجائے ڈی۔ ایس سی کے پی ایچ۔ ڈی کہتا ہے۔ ان کی مضحکہ خیز حرکات اور مکالمے قارئین کے لیے لطف کا باعث ہوتے ہیں۔ لیکن یہ باتیں بلا سبب نہیں ہوتی ہیں۔ ان سے جاسوسی کی گتھیاں سلجھنے میں اکثر مدد ملتی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ابن صفی واحد مصنف ہیں جن کے سسپنس میں مزاح اور مزاح میں سسپنس ہوا کرتا ہے۔ کیا ان خوبیوں کے فنکار کو ادب کی دنیا میں نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟

ابن صفی اپنے ناولوں میں نئے نئے حالات اور واردات کی ایسی دلچسپ دنیا پیدا کر دیتے ہیں کہ قاری خود کو اس میں تحلیل کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنے کرداروں کو عجیب و غریب لیکن بامعنی نام دیتے ہیں جیسے 'فولادمی' (فولاد + آدمی)۔ سیاروں کے مقابلہ کو وہ 'سیارہ بازی' کہتے ہیں اور دوسروں کی ترقی سے فائدہ حاصل کرنے والوں کو 'ترقی چور' کا خطاب دیتے ہیں۔ ایسے الفاظ اور تفردات مصنف کی طباعی، ذکاوت اور خلاقانہ ذہن پر دلیل ہیں۔

ناچیز نے انشائے لطیف میں جن انواع کا تذکرہ شروع میں کیا ہے اس کی تفصیل میں جانے سے معلوم ہوا کہ لطائف کے یہ سارے انواع ابن صفی کے یہاں وافر مقدار میں موجود ہیں۔ ان کی کثرت مصنف کی تحریروں کو بجائے 'انشائے لطیف' کے محدود دائرہ کے 'ادب لطیف' کی وسیع صنف میں شامل کر دیتی ہے۔ پھر جب ابن صفی کی تحریریں 'ادب لطیف' میں شامل ہیں تو انہیں ناول نگار کیوں نہ تسلیم کیا جائے گا؟

اب تک جاسوسی یا سرّی ادب کو تسلیم کرنے کے موضوع پر کوئی گفتگو نہیں ہوئی ہے۔ ناچیز نے کوشش کی ہے کہ سریت سے دامن بچاتے ہوئے بحیثیت ناول نگار کے ابن صفی کا درجہ متعین کیا جائے۔ لیکن ایک سوال یہ بھی ہے کہ مذکورہ خوبیوں میں اگر سریت کی آمیزش ہو جائے تو کیا مصنف کو ناول نگاروں کی

صف سے خارج کر دیا جائے گا؟ یہ رویہ تو خود ادب کے مفاد میں نہیں ہے۔ سر آرتھر کانن ڈائل، مارس لیبلا نک، اگاتھا کرسٹی اور ارل اسٹینلے گارڈنر کو چاہے انگریزی ادیبوں کی صف میں جگہ نہ ملی ہو لیکن ابن صفی کو اپنی دیگر متنوع خصوصیات کی بناء پر اردو زبان کا ایک عظیم ناول نگار تسلیم کرنا پڑے گا، اور یہ ان کا حق ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ان کا یہ حق بھی بنتا ہے کہ چاہے دوسرے جاسوسی نگاروں کو ادب میں جگہ نہ ملے کیونکہ ان کے یہاں ناول نگاری کی دوسری شرائط کا فقدان ہے، ابن صفی کو بطور ایک جاسوسی ناول نگار بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ جاسوسی ناولوں سے الگ ہٹ کر بھی ناچیز ابن صفی کے اسرار، تحیر، اور توہم پرستی سے مملو شاہکار صرف ایک ناول 'تزک دو پیازی' کی مثال دے گا جس کا اردو زبان میں کوئی جواب نہیں ہے۔

ابن صفی کا ایک اور کمال جس کی وجہ سے انہیں اردو ادب میں جگہ ملنی چاہئے یہ ہے کہ کتنے ہی آدمیوں نے ان کی ناولوں کو پڑھنے کے لیے اردو سیکھی ہے۔ یہ وہ فضیلت ہے جو شاید ہی اردو کے کسی ادیب یا شاعر کے حصے میں آئی ہو۔ پھر کیا یہ ناسپاسی نہ ہوگی اگر اردو کے اس محسن کو اردو ادب کے معماروں میں شامل نہ کیا جائے؟

پاکستان میں ابن صفی پر بہت کام ہوا ہے۔ اب ہندوستان میں بھی ابن صفی پر پوسٹ گریجویٹ ریسرچ کے مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں عارف اقبال صاحب نے تقریباً گیارہ سو صفحات پر مشتمل جو ابن صفی انسائیکلو پیڈیا مرتب کی ہے اور اس میں اردو زبان کے تمام ہی چوٹی کے قلم کاروں کی نگارشات کو شامل کیا ہے، اس سے ابن صفی کو ان تمام ہی مصنفین کی سند قبولیت حاصل ہوگئی ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ عارف اقبال صاحب کا تنہا کارنامہ ہے کہ انہوں نے ابن صفی کو پوری اردو دنیا سے اردو کا ایک بے مثل اور بے بدل ناول نگار تسلیم کرا لیا ہے۔ ناچیز کی یہ حقیر کاوش اسی کی بازگشت ہے۔

معروف ادیب، محقق اور ناقد۔ موبائل:09767366183

ادب بے ادب

ریاض احمد خان

لال منیر ہاٹ سابق مشرقی پاکستان کے انتہائی شمال میں ایک چھوٹا سا لیکن خوب صورت اور پڑھے لکھے لوگوں کا شہر ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ دوسرے شہروں کی طرح یہاں کسی قسم کی طبقاتی تفریق نہیں۔ وجہ غالباً یہ ہے کہ آبادی کا تقریباً تمام حصہ تعلیم یافتہ ہے ممکن ہے ایسا اس لیے ہوا ہو کہ یہ پورے مشرقی پاکستان میں ریلوے کے گنے چنے مراکز میں سے ایک ہے جہاں کی بیشتر آبادی ملازم پیشہ ہے اور یہاں بڑے سے بڑے افسر سے لے کر عام افراد تک ریلوے سے وابستہ ہیں۔ اکثریتی طبقے نے دوسرے افراد کو اس طرح اپنے اندر ضم کر لیا ہے کہ یہاں افراد میں کسی قسم کی تفریق رہی ہی نہیں۔ اس طرح بلاشبہ یہ بود و باش کی ایک آئیڈیل جگہ بن گئی ہے۔ یہ اس کا مخصوص پس منظر ہی ہے جس نے تقریباً تمام آبادی کو یہاں کے دو مشہور کتاب گھروں میں ریلوے بک اسٹال اور رحمٰن بک ڈپو سے منسلک کر رکھا ہے۔ جواباً انہوں نے بھی پاکستان کے دوسرے علاقوں سے اس دور دراز علاقے کو جوڑ رکھا ہے اور دوریوں کو قربتوں میں بدل ڈالا ہے ہر قسم کے رسائل' کتب اور اخبارات کی بھرمار ہے۔ لاہور کے ادباء شعرا اور دانش ور ہوں کہ کراچی یا ڈھاکہ کے صحافی اور مصنفین سب وہاں موجود ہیں۔ بلاواسطہ نہیں بالواسطہ ہی سہی۔

بیسویں صدی عیسوی کی ساتویں دہائی ہے۔ ادبی رسائل کی مقبولیت عروج پر ہے نقوش' فنون' نگار' سیپ' افکار' اوراق' ادبی دنیا غرض کہ طرح طرح کے رسائل اور ایک سے بڑھ کر ایک صفحات زیادہ تر تین سو سے پانچ سو صفحات تک دو دو ہزار صفحوں کے خاص نمبر معاذ اللہ۔ اردو زبان میں ڈائجسٹوں کی ابتدا ہے۔ اردو ڈائجسٹ سیارہ ڈائجسٹ منظر عام پر ہیں۔ ان ٹھوس اور بلند قامت اداروں کے مابین کس کی مجال ہے کہ قدم اٹھائے لیکن نہیں اہل ہمت سے زمانہ کبھی خالی نہیں رہا۔ کچھ ایسی شخصیات بھی ہیں جنہیں اپنے زور بازو پر پورا بھروسا ہے اور تن تنہا ان کشتیوں کو پار اتارنا چاہتے ہیں۔ ان کی جہد مسلسل قابل دید و قابل ستائش ہے۔ چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان بڑے بڑے دخانی جہازوں کے ساتھ ساتھ کچھ چھوٹی چھوٹی بادبانی کشتیاں بھی حیرت انگیز طور پر پوری شان و شوکت سے رواں دواں ہیں۔ جاسوسی دنیا' جاسوسی پنجہ' عمران سیریز' رومانی دنیا' مختصر ناولوں کا ایک سلسلہ عجیب جن کی قبولیت عامہ کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔

یہ روشن باجی ہیں' مس روشن لیکن سب کی باجی عزت و احترام کا ایک انداز۔ دروازے کی اوٹ میں

تاک لگائے بیٹھی ہیں۔ بچ نکلنا مشکل اس ماہ کا جاسوسی دنیا کہاں ہے؟ کیا اب تک پہنچا ہی نہیں؟ خیر فی الحال مجھے فلاں فلاں ناول لا دو میں پریشان کہ یہ تو ایک ہی ناول کو کئی کئی بار پڑھ کے ان کا ناس مار دیں گی۔

کہاں میں کتابوں کی جلد بندی اور ان کی سخت حفاظت کا قائل جاسوسی دنیا' عمران سیریز' رومانی دنیا یہاں تک کہ اردو سیارہ ڈائجسٹ کی چار چار کاپیوں کی باضابطہ پختہ جلد بندی کرنے والا وعدہ کر لیا پھر بھی مجھ کبھی کسی اور ساتھی سے کچھ کھلی کا پیاں ادل بدل کر کوٹہ پورا کر دیا۔

لیکن یہ ہیں ان کے چھوٹے بھائی ظفر اللہ ملک مجھ سے دو جماعت آگے انجینئرنگ کے طالب علم ان سے بچ نکلنا ناممکن' یوں تو خاموش طبع اور ریزرونیچر کے انسان لیکن چھپے رستم۔ جاسوسی دنیا بالخصوص عمران سیریز کے ناولوں کے معاملے میں کسی طرح بخشنے کو تیار نہیں۔ سیدھے گھر پر دھاوا تین تین چار چار بار پڑھنے کے باوجود کتابوں کو پھر سے اٹھا لے جانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل۔ غالباً حفظ کرنا چاہتے ہوں۔ حفظ سے یاد آیا والد صاحب طفیل احمد خان حافظ قرآن۔ رات کے دو بج رہے ہیں جاسوسی دنیا کا کوئی ناول ختم کرنے کی کامیاب کوشش کی جا رہی ہے۔ تلاوت قرآن' اخبار بینی اور ماہ نامہ نقاد و دین و دنیا کے مطالعے کے بعد دل پسند مشغلہ۔ مجھے کتابوں کی الماریاں اتنی عزیز کہ کوئی ہاتھ نہ لگائے لیکن انہیں کون منع کرے خود ہی نکالیں خود ہی پڑھیں۔ آخر میں ریمارکس اچھا رائٹر ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سطحیت اور ابتذال نام کو نہیں بڑا صاف ستھرا انداز ہے۔ زمانہ آگے بڑھتا جاتا ہے کہ ایک عجیب حادثہ رونما ہوتا ہے۔

جاسوسی دنیا اور عمران سیریز دونوں کی کہانیوں کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ خبر ملتی ہے کہ ابن صفی کا انتقال ہو گیا۔ ایک دل دادہ کے ریمارکس۔ اب زندگی میں کوئی مزہ نہیں رہا۔ ممکن ہے اوروں کو بناوٹ لگے لیکن اس کی گہرائیوں کا اندازہ کچھ اہل دل ہی لگا سکتے ہیں۔ پھر خبر آئی کہ دماغی خلل کا شکار ہیں اور پھر علاج ہیں۔ دعاؤں کے لیے ہاتھ اٹھ جاتے ہیں۔ ان گنت پھر ایک طوفان آتا ہے جو تمام قدروں کو تہہ وبالا کر کے رکھ دیتا ہے۔ لوگ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ ان کا سب کچھ کھو جاتا ہے۔ رابطے ختم ہو جاتے ہیں اور تمام قسم کے سلسلے منقطع لال منیر ہاٹ تو کیا پورا مشرقی پاکستان ایک سیاسی زلزلے کی لپیٹ میں آ جاتا ہے اور بالآخر طوفان کی نذر ساکت و جامد طوفانوں کی سرزمین جو تھا۔ لوگوں کے تمام قسم کے عمومی جذبات بے حسی کا شکار ہو جاتے ہیں بلکہ معدوم کسی کو کچھ یاد نہیں رہتا کسی کا کوئی نہیں ہوتا......!

اب تک جو بھی تصویریں فلم کے مختلف مناظر کی طرح بالترتیب یا بے ترتیب سوچ کے کہر سے نمودار ہوئیں ان سے یہی نتیجہ نکلا کہ جاسوسی دنیا اور عمران سیریز جاسوسی ناولوں کے دو ایسے سلسلے تھے جو عوام

دخواص' بڑوں اور بوڑھوں' جوانوں اور بچوں' مردوں اور عورتوں سب میں یکساں طور پر مقبول تھے اور ظاہر ہے چونکہ یہ ہمارے تفریحی ادب کا ایک بے مثل اور نمایاں حصہ ہیں پہلے بھی مقبول تھے اب بھی ہیں۔

یہاں ابن صفی کے ناولوں کی عوامی مقبولیت پر تفصیلی روشنی ڈالنے کی ضرورت یوں پیش آئی اور ہنوز ہے کہ ہماری ادبی دنیا اور ادب کی تاریخ میں ان کے ساتھ مسلسل امتیازی سلوک برتا گیا۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ انہیں درخور اعتنا ہی نہ سمجھا گیا۔ ممکن ہے اس کی خاص وجہ اس کا عوامی انداز ہو یا مقصدیت کی کمی یا مخصوص موضوع ہو یا اس کی صوتی صورت حال یہ عام کی تمام مفروضے ہیں۔ حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ بہرحال جو بھی ہو یہ کوئی شجر ممنوعہ تو نہیں تھا کہ جس پر کوئی بحث ہو ہی نہیں سکتی تھی یا اس پر بحث کرنا ادبی دنیا میں تضیع اوقات کے مترادف سمجھا جاتا۔ بہر طور اب یہ مناسب موقع ہے کہ ''نیا رخ'' کے سوویں شمارے کے پیش نظر ابن صفی اور ان کے ناولوں کا اس رخ سے بھی جائزہ لیا جائے اور ان کے ادبی مقام کے تعین کی کوشش کی جائے تا آنکہ ان کے ساتھ اس مسلسل جارحانہ عمل یا لاتعلقی کا تدارک ممکن ہو سکے۔

کسی بھی ادب کے لیے اس کے قاری کا ہونا ضروری ہے کہ یہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں چنانچہ ہم اس کی مقبولیت کا اندازہ اس کے حلقہ ارادت کی وسعت سے ہی کرتے ہیں۔ یہاں یہ واضح رہے کہ کسی بھی ادب کی عوام میں مقبولیت کے امکانات اس وقت روشن تر ہو جاتے ہیں جب اس میں اپنے زمانے کی عکاسی کی گئی ہو۔ نیز اس کی زبان بھی آسان اور عام فہم ہو۔ ظاہر ہے اردگرد کے ماحول سے کٹی ہوئی تحریر میں قارئین کی دلچسپی کا سامان کم سے کم ہوتا ہے جبکہ بے توجہی کے امکانات زیادہ سے زیادہ ہوتے ہیں۔ ہمیں اس حقیقت کا اندازہ بخوبی ہے کہ جب بھی قاری کچھ پڑھنا چاہتا ہے زیر مطالعہ تحریر سے اپنا رشتہ کسی نہ کسی طرح بلاواسطہ یا بالواسطہ محسوس یا غیر محسوس' شعوری یا لاشعوری طور پر' صوری یا معنوی کسی لحاظ سے بھی قائم کر لیتا ہے اور جو بھی رسپانس اسے وہاں سے ملتا ہے اس کے مطابق دوبارہ اپنا ردعمل ظاہر کرتا ہے یا محفوظ رکھتا ہے۔

یہ وہ حقائق ہیں جن کا ادراک اردو نثر کی تاریخ میں سب سے پہلے سرسید احمد خان کو ہوا' خواہ اس کی وجہ ان کی اپنے مشن میں حد سے بڑھی ہوئی دلچسپی رہی ہو یا کچھ اور بہر حال یہ واضح ہے کہ ادب کے ذریعے عوام سے براہ راست اور وسیع النظر رابطہ کو انہوں نے شعوری اور عملی طور پر بڑی اہمیت دی۔ اس طرح سرسید اور ان کے مکتب فکر سے وابستہ افراد خواہ وہ نثر نگار ہوں یا شاعر ہر ایک نے سعی پیہم سے کام لیتے ہوئے جدید اردو نثر یا نظم گوئی کی بنیاد رکھی۔ جس کا پیرایہ بیان آسان اور عام فہم تھا اور جس میں

موضوع سے قارئین کی دلچسپی ہر جگہ قائم رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ظاہر ہے اپنی تحریر کی ان خصوصیات کی بنا پر دیکھتے ہی دیکھتے ان کا رابطہ عوام کے بڑے سے بڑے طبقے سے قائم ہو گیا اور انہوں نے حساب مرادان سب کی طرف سے ردعمل کے طور پر خوب خوب داد و تحسین وصول کی۔ بعدہ اپنے زمانے میں جیسا کہ پہلے ذکر ہوا اپنی تحریر کی انہی خوبیوں کی بنا پر ابن صفی نے عوام میں اپنی مقبولیت کا لوہا منوایا اور اس سلسلے میں سب سے بلند علم نصب کرنے کی سعادت حاصل کی۔ تن تنہا ایسا ادارہ قائم کیا جہاں سے ہر ماہ دو جاسوسی ناول منظر عام پر آتے ہیں اور وہ بھی خود ان کے لکھے ہوئے۔ عمران سیریز کے جاسوسی ناولوں کا اجراء اسرار پبلی کیشنز کراچی کے تحت اور جاسوسی دنیا کے ناولوں کا سلسلہ بہ یک وقت کراچی اور عباس حسینی کی زیر نگرانی الہ آباد سے۔ ہندوستان میں ان کے ناولوں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر الہ آباد سے ہی جاسوسی دنیا کا ہندی ورژن بھی۔ مجھے یاد آتا ہے کہ جاسوسی دنیا اردو کراچی' عمران سیریز اردو کراچی' جاسوسی پنجہ اردو الہ آباد (مصنف اکرم الہ آبادی) جاسوسی دنیا ہندی الہ آباد' جاسوسی دنیا اردو الہ آباد' رومانی دنیا اور الہ آباد کے سلسلوں میں موخر الذکر تین سلسلے اپنے سرورق کی وجہ سے اتنے دل کش اور لاجواب ہوتے تھے کہ میری اور اس سلسلے کے دوسرے کئی صاحب ذوق افراد کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ الہ آباد والے ایڈیشنز کا سیٹ کسی طرح ٹوٹنے نہ پائے۔

زیر نظر جائزے میں ایک جگہ جاسوسی پنجہ الہ آباد کا بھی نام آیا ہے۔ اس سلسلے کے مصنف اکرم الہ آبادی تھے جنہوں نے غالباً ابن صفی کے مقابلے میں لکھنا شروع کیا تھا۔ یہ مقبولیت میں نمبر دو پر تھے۔ انہوں نے بھی اپنی کہانیوں میں جاسوسی دنیا کے مشہور کرداروں پر فریدی اور حمید کے طرز پر دو کردار خان اور بالے تشکیل دیئے لیکن ظاہر ہے وہ بات پیدا نہیں ہونے پائی جو جاسوسی دنیا کے کرداروں میں تھی۔ حمید اور فریدی کے کردار آئینے کی طرح صاف اور شفاف تھے جن کا ہر رخ شروع سے لے کر آخر تک بالکل واضح اور غیر متبدل رہا جبکہ خان اور بالے کے کرداروں کے تمام رخ ٹھوس شکل میں نظر نہیں آتے۔ بالخصوص بالے کے کردار میں کافی ملاوٹ نظر آتی ہے اور کبھی کبھی عمران کی جھلک بھی ملتی ہے پھر ابن صفی کے رائیول کردار بھی اپنی اپنی جگہ اتنے ٹھوس اور مستحکم ہیں اور وہ ایک ایسے پر شکوہ نظام کے تحت کام کر رہے ہیں کہ یہ اکرم الہ آبادی سے ممکن نہیں ہو سکا۔ بہر حال ان کی انتھک محنت اور کوشش پیہم کے پیش نظر ہم یہاں کہہ سکتے ہیں کہ جاسوسی کہانیاں لکھنے والوں میں انہوں نے دوسری پوزیشن حاصل کر لی لیکن حفظ مراتب میں یہاں یہ بھی واضح رہے کہ ان دونوں کے درمیان مقبولیت عامہ کے پیش نظر اور فنی لحاظ سے بھی کافی فرق موجود ہے۔ بلاشبہ ابن صفی ان سے بہت آگے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ نوجوانوں میں مقبولیت عام بلکہ مقبولیت کا تاج منٹو' کرشن' اختر شیرانی اور مجاز کے

سروں پر جگمگا تا تھا اور دنیا رشک کرتی تھی ایک یہ زمانہ ہے کہ ابن صفی کے سر پر سجے تاج نے کئی ایک کی نگاہیں اس طرح خیرہ کیں کہ وہ اپنے حواس کھو بیٹھے اور وہ قلم کو داؤ پر لگانے سے بھی نہیں ہچکچائے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ناموس قلم کو بیچ کھایا۔ ملتے جلتے نقلی تاج تیار ہوئے اور سروں پر رکھ لیے گئے۔ دونوں مقبول سلسلوں کے نام سے لے کر ان کے کردار حمید' فریدی' عمران' قاسم' صفدر' (وغیرہ) تک کا چربہ تیار کیا گیا اور انہیں ہو بہو ان کے اپنے ناموں کے ساتھ بھانت بھانت کے ناولوں میں رواج دینے کی کوشش کی گئی۔ قارئین کی آنکھوں پر دن کی تند و تیز روشنی میں پٹی باندھنے کی کوشش کی گئی۔ خود اپنے نام تک تبدیل کر لیے گئے اور ابن صفی کے نام سے ملتے جلتے مصنفین کا سلسلہ چل نکلا۔ ابن کہیں این ہو گئی تو کہیں ابو اور کہیں ب تشدد ہو گیا۔ یہ لوگ خود تو کیا شہرت حاصل کرتے ابن صفی کے نام کو مزید روشن اور ان کی شخصیت کو مستحکم سے مستحکم کرتے چلے گئے۔ پھر ایک وقت آیا کہ ابن صفی نے قارئین کی دشواریوں کے پیش نظر اپنی کتاب کے آخری صفحہ پر ایک ٹریڈ مارک جاری کیا جس میں ایک شخص کے ہاتھ میں پستول دکھایا گیا جب کہ اس کے مقابل شخص کو پشت کی جانب گرتے ہوئے۔ ٹریڈ مارک کے جاری ہونے کے بعد یہ دیکھنے میں آیا کہ دوسری کتابوں کے آخر میں ملتے جلتے ٹریڈ مارک آنا شروع ہو گئے۔ پستول کی جگہ ہاتھ میں چاقو دکھایا گیا ظاہر ہے ہر کوئی محدب شیشہ لے کر تو پھرنے سے رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر تنگ آ کر ابن صفی نے کتابوں کے آخر میں اپنی تصویر چھپوانا شروع کر دی۔ اس ساری تفصیل سے اب یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہا کہ ابن صفی کس پایہ کے مصنف تھے اور عوام میں ان کی مقبولیت کا کیا عالم تھا۔

یہ ان کی عوامی مقبولیت کا بام عروج ہے کہ ناولوں کے بعد جب موجودہ صنعتی دور میں انسان کی عدیم الفرصتی کے پیش نظر افسانوں' مختصر کہانیوں اور ٹی وی ڈراموں کو فروغ حاصل ہوا تو جاسوسی کہانیوں کو بھی غیر معمولی پذیرائی ملی اور ڈائجسٹوں کے اس دور میں جب خالص ادبی رسائل کافی گھٹ گئے ہیں تعداد' ضخامت اور حلقہ ارادت کے لحاظ سے خواہ اس کی وجوہات کچھ بھی ہوں' جو فی الحال موضوع نہیں' کوئی ڈائجسٹ ایسا نہیں جس میں جاسوسی کہانیاں نہ ہوتی ہوں۔ خالص جاسوسی کہانیوں پر مشتمل تقریباً درجن بھر ڈائجسٹ اپنی مستقل حیثیت میں جاری ہیں اور ان میں سے کئی ایک خود ابن صفی کے جاری کیے ہوئے ہیں جن میں ان کی اپنی مختصر جاسوسی کہانیاں بھی چھپتی رہیں۔

مصنف اور قاری کے اس رشتے کو جو اردو نثر کی تاریخ میں قابل دید اور بے مثل ہے ہم کیوں کر چیلنج کر سکتے ہیں یا یہ کہ ادب میں اس قسم کے رشتوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ کہنا کسی طرح بھی آسان نہیں۔ جاسوسی ادب ساری دنیا میں مقبول ہو چکا ہے۔ بیسٹ سیلر کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔

وقفے وقفے سے بین الاقوامی شہرت کے مصنفین سے دنیا متعارف ہو رہی ہے۔ بین الاقوامی سطح کی فلمیں مسلسل آ رہی ہیں۔ جنہیں ان کے مصنفین کے ناموں کی سند حاصل ہے۔ ایسی صورت میں ہم کب تک ریت کے اندر سر ڈالے پڑے رہیں گے۔ یہ بلا جواز خاموشی ہے ضرورت ہے کہ اس جمی ہوئی برف کو توڑا جائے اور پانی کو بہنے دیا جائے۔ دیکھا جائے کہ اس سے کوئی ریلا نکلتا ہے یا نہیں۔ اس میں مضبوط سے مضبوط شہتیر اور بڑے سے بڑے بت بہالے جانے کی صلاحیت موجود ہے یا نہیں۔

اگر نوعیت اور افادیت کے لحاظ سے کسی کو کنفیوژن ہے کہ یہ ادب کے زمرے میں آتی بھی ہیں یا نہیں اور آیا ان پر لب کشائی تضیع اوقات تو نہیں تو بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ طرز عمل بزم خود ادب کے بنیادی تقاضوں سے صاف صاف انحراف ہے یا اس سے متصادم۔ ادب ایک ایسا دائرہ تحریر ہے جو تمام شعبہ ہائے زندگی پر محیط ہے تجسس جاسوسی کہانیوں کا مرکزی رویہ ہے اور یہی علم کی بنیاد بھی ہے پھر ان کا موضوع زندگی کے حقائق سے یا اس کے ذوق آگہی سے کیونکر منحرف یا متصادم ہوسکتا ہے۔ عمل اور ردعمل، نیکی اور بدی برائی اور اس کا خمیازہ کیا کارزار حیات کے لازمے نہیں؟ پھر کیا یہی سب کچھ جاسوسی کہانیوں کے خام مواد نہیں؟ اگر ایسا ہے تو یہ کہنا کیوں کر ممکن ہے کہ یہ ادب کے تقاضوں سے متصادم یا عاری ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ان میں بزم و رزم کی آویزش اور اس سے جنم لینے والی صورتحال کا سامنا کرنے کی پوری طاقت موجود ہے اور موجودہ صنعتی اور مشینی دور میں تیزی سے روبہ زوال معاشرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر صورت حال کے تجزیے کی صلاحیت بھی یہ ایک ایسا سائنسی علم ہے جس کے بغیر موجودہ تہذیب بالخصوص مغربی معاشرہ ناممکن اور مزید انحطاط پذیر ہی ہوسکتا ہے سنبھل نہیں سکتا۔ جرم و سزا کے اس دور میں اس کی افادیت سے انکار سورج کی موجودگی میں روشنی سے انکار کے مترادف ہے۔ ان افراد کی نظروں میں جو ذہن رسا کے مالک ہیں، تو یہ اپنی ان خوبیوں کے باوجود تفریحی ادب میں شامل کیے جانے کے لائق ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی رہ جاتی ہے کہ ہم اسے اپنی توجہ کا مستحق سمجھیں اور دیگر اصناف ادب کی طرح کھلے دل سے اس بات کا جائزہ لیں کہ جملہ معنوی محاسن اور مخصوص فنی پس منظر کے باوصف اسے مستقل صنف ادب قرار دیا جاسکتا ہے یا نہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس سے قبل اس سے کہیں کم تر اور چھوٹے کینوس کے شعبہ ہائے ادب کو جب بھی ماحول سازگار ملا مستقل اصناف ادب کا درجہ دیا جاتا رہا ہے پھر اس کے ساتھ یہ ترجیحی سلوک کیوں اور کب تک؟ جدید سائنسی دور میں جب جرم و سزا کا موضوع ایک خاص اہمیت اختیار کر چکا ہے اور ان کے حل کے لیے مختلف سائنسی تکنیک بھی استعمال کی جارہی ہیں کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم اس شعبہ علم کو باضابطہ فروغ دینے کی فکر کریں اور اس سلسلے میں موزوں علمی اور عملی اقدامات سے کام لیں۔ اگر

ایسا ممکن ہوا تو ایک طرف تو یہ موجودہ معاشرتی مسائل کے حل میں ہمارا بہترین تعاون ہوگا' دوسری طرف نثری ادب میں ایک قابل قدر اضافہ اور ادبی شخصیتوں میں اس قبیلے کی مناسب پذیرائی ہونی چاہیے۔

جہاں تک عوام الناس میں جن میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی بھی کمی نہیں ابن صفی کی پذیرائی کا تعلق ہے وہ بلا شبہ قابل رشک ہے۔ وہ اس قلم قبیلے کے سرخیل بھی ہیں اور باوا آدم بھی۔

ابن صفی نے اپنے ناولوں میں اس کے مخصوص موضوعی رجحان کے باوصف ادب کے دوسرے فنی تقاضوں کو بھی ہمیشہ پیش نظر رکھا اور ان سے پورا پورا انصاف کیا بلکہ بعض معاملات میں بہترین مثال قائم کی۔ ابن صفی کو عام ناول نگاروں کے مقابلے میں ایک آسانی یہ حاصل تھی کہ تجسس جو قصے کہانیوں' افسانے اور ناولوں کا ایک ضروری عنصر ہے کے سلسلے میں زیادہ پریشانی نہیں اٹھانا پڑی کیونکہ دوسرے اصناف کے مقابلے میں اپنی نوعیت کے پیش نظر یہ ازخود ساری کہانی کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہوتا ہے۔ یہی وہ عنصر ہے جو ایک قاری کو اپنے مصنف سے قریب تر رکھتا ہے۔ اس آسانی کے مہیا ہونے کے باوجود ابن صفی اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ مزید دلچسپی کے پیش نظر جگہ جگہ اپنی تحریر میں طنز و ظرافت کے پھول کھلائے جاتے ہیں۔ اس امر پر انہوں نے ایسی خصوصی توجہ دی ہے کہ اسے باضابطہ عمران' قاسم اور حمید کے کردار کا حصہ بنا دیا ہے یہاں تک کہ یہ بھرتی کی چیز نہیں معلوم ہوتے بلکہ نیچرل اور بے ساختہ طور پر سامنے آتے ہیں خاص التزام یہ رکھا ہے کہ ان کی گفتگو اور عمل سے کہیں بھی سطحیت یا عامیانہ پن کا احساس نہ ہونے پائے۔ کہانیوں کے ان طویل سلسلوں میں ہر جگہ اس کیریکٹر کو قائم رکھنا ایک مشکل امر ہے جو ابن صفی کے پورے کنٹرول میں ہے۔ تحیر' سنسنی' واقعات کا زیر و بم اور تسلسل ان کی کہانیوں کے وہ اوصاف ہیں جو قاری کو کہیں مایوس نہیں کرتے پھر خاص خیال یہ رکھا ہے کہ گفتگو' طرز عمل اور کہانیوں کے اندر پیش آنے والے واقعات و واردات میں تکرار نہ ہونے پائے یہ ایک مشکل کام ہے بالخصوص جاسوسی کہانیوں میں جہاں اس خامی کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔

جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے اس پر بہت کچھ پہلے ہی لکھا گیا ظاہر ہے ان میں جان نہ ہوتی اور یہ اتنے دلچسپ' کامیاب اور مستحکم نہیں ہوتے تو انہیں یہ ہر دل عزیزی کہاں حاصل ہوتی اور ان کی اتنی چربہ کاپیاں کہاں سے پیدا ہوتیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابن صفی نے اپنے ناولوں کے لیے جو کردار تخلیق کیے ہیں۔ اس کی نظیر ہماری نثری تاریخ میں خال خال ہی ملتی ہے۔ بالخصوص قبولیت عامہ کے سلسلہ میں اگر یہ کہا جائے کہ ابن صفی کی کامیابی اور شہرت کا راز ہی یہ کردار ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ ان میں اختلاف رائے کے امکانات کے ساتھ سب سے مضبوط اور توانا کردار فریدی کا معلوم ہوتا ہے۔ جو اپنے کریکٹر

صلاحیتوں قوت فیصلہ اور ہر لحاظ سے اپنی مکمل اور پر وقار شخصیت کے باعث قارئین میں حد درجہ مقبول ہے۔ حمید ایک طرف اپنی صلاحیت کا لوہا فریدی جیسے شخص سے جسے وہ جگہ جگہ اس کی اصول پسندی اور سخت رویہ کے باعث کرنل ہارڈ اسٹون کے نام سے یاد کرتا ہے' سے بھی منوالیتا ہے تو دوسری طرف اپنی شگفتہ مزاجی کی وجہ سے فریدی سے کافی حد تک الگ تھلگ دکھائی دیتا ہے یہ نوجوان قاریوں میں کافی مقبول ہے۔

رومانس جاسوسی کہانیوں کا ایک مشکل عنصر ہے لیکن حمید کی رومانی شخصیت کے سہارے ابن صفی نے اس کے لیے بھی بڑی کامیاب راہ نکالی ہے اور ہر قسم کی سطحیت اور ابتذال سے مکمل پرہیز کرتے ہوئے اس کی ہر مشکل گھاٹی کو خوش اسلوبی سے طے کیا ہے۔ یہ ایک ایسا امتیاز ہے جو خصوصی طور پر جاسوسی کہانیاں لکھنے والے کم افراد کو حاصل ہوسکا اکثر و بیشتر جاسوسی کہانیوں میں عریانیت اور فحش مناظر کے ذریعے اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ابن صفی نے ایسی جگہوں پر خاص خیال یہ رکھا کہ عشق کا وقار اور عورت کا تقدس کہیں پامال یا مجروح نہ ہونے پائے۔ یہ ایک مشکل کام تھا خصوصاً جب کہ ان کے سارے ناولوں میں یہ فضا حمید کے حوالے سے چھائی رہتی ہے۔ یہ حمید کی شخصیت کا وہ پہلو ہے جس کے پیش نظر ہر نوع کے قاری اسے خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

عمران ابن صفی کے ناولوں کا وہ انوکھا کردار ہے جس میں بیک وقت حمید بھی موجود ہے اور فریدی بھی۔ کہیں دونوں سے کچھ آگے کہیں پیچھے۔ بہرحال ذہانت اور عقل و دانش میں حمید کا اس سے کوئی مقابلہ نہیں۔ حیرت انگیز طور پر چست و چالاک' حاضر دماغ اور ہر کچھ کسی بھی طرح سے کر گزرنے کی صلاحیت سے معمور۔ پلاٹ ایسا کہ لوگ عش عش کر اٹھیں۔

قاسم اور صفدر کا کردار بھی مخصوص نوعیت کے مستقل کردار ہیں۔ بلیک زیرو' ابن صفی کی جاسوسی کہانیوں کے مستحکم نظام میں ایک انوکھا اور عجیب و غریب کردار ہے ظاہر ہے یہ کام عمران سے ہی لیا جاسکتا تھا۔ تھریسیا' بمبل بی آف بوہیمیا' سنگ ہی' ڈاکٹر ڈریڈ' وغیرہ جرائم کی دنیا کے مخصوص کردار ہیں۔ جن کی کردار سازی ابن صفی نے بڑی عرق ریزی سے کی ہے اور ان کی تشکیل سے اپنی حیرت انگیز ذہانت اور تخلیقی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے بغیر ان کا جاسوسی نظام کسی طرح اتنا مکمل' مضبوط اور تحیر خیز نہیں ہوسکتا تھا کہ پڑھنے والے حیرت زدہ رہ جائیں اور لکھنے والے مجبور۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اصل اور نقل کے راستے جدا جدا ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک ہر ایک کی رسائی نہیں۔

ناول اور اس کے کرداروں کی نوعیت کے لحاظ سے ان کے یہاں نہایت کامیاب اور پر اثر منظر نگاری بھی ملتی ہے۔ یہ کرداروں کی شخصیت اور حالات و واقعات نیز ان کی سنگینی کے پیش نظر بدلتی رہتی ہے

اور ہر جگہ مکمل طور پر ان سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ جہاں کہیں مجرموں کے مخصوص علاقوں اور مقابلے ونکراؤ کی منظر نگاری کی ہے متصادم کرداروں کے رتبے اور قد کا خاص خیال رکھا ہے۔ چنانچہ زمین کے بادل' شعلوں کا ناچ' وغیرہ میں یہ قابل دید ہے۔

اسی طرح مکالمہ نگاری پر بھی انہوں نے اپنی توجہ مسلسل یوں قائم رکھی ہے کہ یہ کرداروں کے مزاج اور ان کے کیریکٹر کے عین مطابق ہو۔ منشی پریم چند کے یہاں یہ التزام قابل رشک حد تک خوش نما دکھائی دیتا ہے لیکن جب ہم حمید' عمران اور قاسم کے مکالمات اور ان کے درمیان ہونے والی گفتگو پر نظر ڈالتے ہیں تو مصنف کو داد دیے بغیر نہیں رہتے اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ آخر ابن صفی سے وہ کون سی غلطی سرزد ہوئی کہ ہماری ادبی دنیا نے انہیں توجہ کے قابل نہ سمجھا' یہ وہ کردار ہیں جو اپنی زبان اور گفتگو سے ہی پہچانے جاتے ہیں اور ان کے بغیر مکمل نہیں ہوتے۔ یہ ایک مشکل کام تھا خصوصاً اس وقت جب کئی کردار اور سیکڑوں کہانیوں کا بار گراں ایک کاندھے پر تھا اور پائے استقامت میں لغزش نہ آنے کی شرط بھی لگی ہوئی تھی۔

جہاں تک ابن صفی کے ناولوں کی صوتی خوبیوں کا تعلق ہے ظاہر ہے یہ اپنے نہایت وسیع حلقہ ارادات کے پیش نظر عام فہم اور سلیس ہے۔ ان کے قلم میں بلاغت بھی ہے اور روانی بھی۔ تحریر کو ہلکے پھلکے طنز و مزاح کی مدد سے قارئین کے لیے مزید دلچسپ بنایا گیا ہے جہاں کہیں لطف و مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مکالموں اور فقروں میں موزونیت کا خیال رکھتے ہوئے فارسی یا ہندی کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ نئے نئے الفاظ اور تراکیب کی تخلیق جن کا وجود ہماری لغت یا زبان میں نہ ہو ابن صفی کی جولانی طبع کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ الفاظ ان کے بہت سے قاریوں کو تو کافی پسند آتے ہیں اور ان میں سے اکثر ان سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں لیکن احتمال ہے کہ اہل ادب ان کی منظوری نہ دیں بہر حال یہ ان کا ایسا قابل گرفت رویہ بھی نہ ہوگا۔ ادب شناسوں کے لیے اتنی لچک تو رکھنا ہی ہوگی۔

جہاں تک پلاٹ کہانی کے کلائمکس اور رزلٹ کا تعلق ہے یہ ان ناولوں کے اپنے مخصوص مزاج کے باوصف دیگر تفریحی اصناف ادب سے بالکل مختلف ہیں اور ان سے نمٹنا قدرے آسان ہے۔ خصوصاً اس وقت جب قلم ابن صفی کے ہاتھ میں ہو۔ جہاں تک جاسوسی کہانیوں کے موضوعات و معاملات کا تعلق ہے یہ بڑے پیچیدہ مشکل ہوتے ہیں اس نوع کی نئی نئی کہانیاں تیار کرنا کیس کو الجھانا اور پھر انہیں سلجھانا کافی مشکل اور مرحلہ وار مسئلہ ہوتا ہے بالخصوص اس صورت میں جب کہ ہر ماہ دو ناول لکھنے کی پابندی ہو اور ان کی تعداد سینکڑوں میں جا پہنچے ان میں سے کسی دو میں بھی موضوع کی یکسانیت نہ ہونے کی شرط بھی عائد ہو اور مسئلے اور واقعات کو پھیلانے اور سمیٹنے کے لیے جگہ بھی محدود اور مخصوص۔ یہ وہ مشکل مرحلے

ہیں کہ بڑے سے بڑے قلم کار کے چھکے چھوٹ جائیں۔
اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس مرحلے کو لوگوں نے مصنوعی طور پر نیز کافی حد تک ناموزوں طریقے سے مافوق الفطرت واقعات اور سائنسی ایجادات جن کا کہیں وجود نہ ہو کے سہارے طے کرنے کی کوشش کی ہے اور عقل وفہم نیز حاضر دماغی کو ایک طرف رکھ چھوڑا ہے۔ یہ جاسوسی ناولوں کی ایک ایسی خامی ہے جس پر اکثر مشہور و معروف مغربی مصنفین بھی قابو نہیں پا سکے اور انہوں نے اپنی سہل پسندی کا ثبوت دیا۔ جب کہ ابن صفی نے اس چیلنج کا بھی جواں مردی سے مقابلہ کیا اور فطرت انسانی کے تقاضوں کے عین مطابق حالات وواقعات پر انسانی عقل ودانش، حاضر دماغی اور چستی و پھرتی کے سہارے قابو پانے کی کوشش کی ان کے یہاں ہمیں مافوق الفطرت سہاروں سے واضح طور پر اجتناب کی کوشش ملتی ہے ایسا ان کے فطری رجحان اور مشکل پسند طبیعت کی وجہ سے ممکن ہو سکا۔
جب کبھی ہم اپنے ادب کی تاریخ پر نظر دوڑاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان میں کئی شخصیتیں ایسی بھی موجود ہیں جنہوں نے کسی صنف ادب کے تمام فنی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اردو میں اس کی بنیاد رکھی یا وہ مبتدیوں میں ہوئے اور اپنی زندگی میں ہی اسے بام عروج تک پہنچا دیا۔ میر انیس، پریم چند، وغیرہ کے نام اس حوالے سے ایسے روشن ہیں کہ محتاج بیان نہیں۔ جاسوسی کہانیوں کے سلسلہ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ابن صفی وہ ناقابل تسخیر شخصیت ہیں کہ جنہوں نے مذکورہ صنف کے تمام تقاضوں کو باسانی تو نہیں البتہ نہایت کامیابی سے پورا کرتے ہوئے درجہ کمال تک پہنچایا۔ انہوں نے اس شعبہ نثر پر شروع سے لے کر آخر تک انتھک محنت کی۔ یہ ان کا ایک ایسا قابل رشک امتیاز ہے جو ہماری اردو نثر کی تاریخ میں کم کو ہی نصیب ہوا۔
انہوں نے جاسوسی دنیا کے سلسلے کے کل ۱۲۵ ناول لکھے جبکہ عمران سیریز کے مجموعی طور پر ۱۲۰ ناول تحریر کیے جو عددی لحاظ سے بھی ہمارے نثری ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ ان میں سے زیادہ تر کہانیاں اپنی اپنی انفرادی جلدوں میں مکمل ہیں جبکہ چند کا سلسلہ چار چار پانچ پانچ کتابوں پر پھیلا ہوا ہے مثلاً پہلا شعلہ، دوسرا شعلہ، تیسرا شعلہ، چوتھا شعلہ، اور جہنم کا شعلہ'' یا ڈاکٹر ڈریڈ اور سنگ ہی سے متعلق کہانیوں کے سلسلے اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ابن صفی نے جرائم کی دنیا میں کچھ کردار ایسے تخلیق کیے تھے جن کی ذہانت وفطانت قارئین کو اتنا متاثر کر گئی کہ ان کا جلد ختم ہو جانا انہیں کسی طور پسند نہ ہوا۔ پس ان کی خواہشوں کے پیش نظر انہوں نے ان کا سلسلہ کئی کتابوں تک پھیلا دیا۔ یہ اتنے مضبوط کردار تھے کہ موت خود ابن صفی پر حاوی ہو گئی لیکن ان پر قابو نہیں پا سکی۔ اب یہ ابن صفی کا نام روشن کیے ہوئے ہیں۔
قارئین کے مسلسل اصرار پر ہی انہوں نے ''زمین کے بادل'' میں حمید، فریدی اور عمران کو یکجا کر دیا یہ

ایک مشکل اور رسکی مسئلہ تھا جس پر ابن صفی نے اپنی ذہانت کے بل بوتے پر قابو پایا دراصل قارئین کا مقصد یہ اندازہ قائم کرنا تھا کہ دیکھیں فریدی اور عمران میں سے کون سا کردار حاوی ہے اور ایک دوسرے سے کتنا آگے۔ جبکہ ابن صفی کو اپنا بنائے ہوئے نظام میں کوئی خلل منظور نہ تھا۔ ظاہر ہے یہ دونوں کرداران کے ناولوں کے دو الگ الگ سلسلوں کے بے تاج بادشاہ تھے اور ان میں سے ہر دو کی عزت کو قائم رکھنا ان کی ذمہ داری۔ بہرحال اس مشکل مرحلے سے وہ کامیاب گزرے۔ یہ قلم پر ان کی مضبوط گرفت کی ایک واضح دلیل ہے۔ زمین کے بادل وہ واحد ناول ہے جسے قارئین کے اصرار پر آفسٹ تصاویر سے مزین کیا گیا ہے اکثر سلسلہ وار کہانیوں کے اختتام پر انہوں نے خاص نمبر بھی پیش کیے ہیں یہاں یہ واضح رہے کہ یہ سلسلہ وار ناول اس طرح کے نہیں ان میں کہانیوں کا سلسلہ ایک دوسرے سے پیوستہ ہو بلکہ ایک ہی مجرم کی الگ الگ واردات پر مشتمل الگ الگ مکمل کہانیاں ہیں۔

ابن صفی نے آخری عمر میں کئی ڈائجسٹ بھی نکالے جواب تک جاری ہیں اور جن میں جاسوسی کہانیاں یا سلسلہ وار ناول چھپتے ہیں۔ گویا اس صنف میں انہوں نے خود کو ایک مکمل باب کی حیثیت دے ڈالی جس کا تفصیلی جائزہ یہاں ممکن نہیں۔ ان کی صحافتی زندگی کا یہ کوئی دھما کہ خیز انکشاف نہیں تھا بلکہ پہلے بھی ہم اس کی جھلک ناولوں کے دونوں سلسلوں کے اداریوں میں دیکھتے آرہے تھے اگر ان سب کو سیاق وسباق کے ساتھ یکجا کر کے دیکھا جائے تو یہ ان کی شخصیت کے اس رخ کو بے نقاب کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ ان کا اپنا ایک الگ مزہ ہے۔ ایک الگ حیثیت ہے۔ پھر ناولوں کے دو سلسلوں کا پاکستان اور ہند کے دو مشہور شہروں سے مسلسل اجرا خود بھی تو ان کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہے۔

نیا رخ فروری ۱۹۸۹ء

شجرِ ممنوعہ کے برگ، گل اور ثمر ابن صفی کا تخلیقی اُفق

ادریس شاہجہانپوری

آخر "آخری آدمی" کا مصنف آخری ہی ثابت ہوا۔

ہر لحاظ سے آخری، ادب میں جنسی تلذذ کے سیلاب کے سامنے سدِّ سکندری بننے والا پہلا "دلیر" اور "آخری آدمی"۔ جاسوسی ناول نگاری میں متنوع پلاٹ و موضوعات پیش کرنے والا آخری مصنف، منظر نگاری میں نئے رنگ بھرنے والا آخری مصور، زندہ جاوید اور لافانی مستقل و غیر مستقل کرداروں کا آخری خالق، برجستہ مکالمہ نگاری کا آخری فلمکار، سنسنی کے ساتھ رومانیت کا حسین امتزاج پیش کرنے والا آخری "فنکار"، سراغ رسانی کی سنگلاخ چٹانوں میں اپنے توانا قلم کے تیشے سے طنز و مزاح کے میٹھے چشمے جاری کرنے والا آخری "فرہاد"، جاسوسی ناول نگاری میں ادب کی آواز اٹھانے والا آخری نقیب، شگفتہ اور سبک جملے تحریر کرنے والا آخری دبیر، انفرادیت میں بھی ندرت پیدا کرنے والا آخری "نادر"، بے نظیر تشبیہات سے مسحور کرنے والا آخری ساحر، ظرافت کے میدان کا آخری شہسوار، علمی حوالوں کی کثرت کے لیے معروف "علامہ"، سری ادب کے خشک میدان میں پند و نصائح کے گل کھلانے والا آخری باغبان، اپنے ہم عصروں کو ادبی "ہیجان" میں مبتلا کرنے والا آخری مورخ، مسموم فضا کو اپنے ترکش کے "تیروں" سے تار تار کرنے والا آخری تیر انداز، اردو کی مسیحائی میں صحرا نوردی کرنے والا آخری "صحرائی دیوانہ"، جاسوسی ناول نگاری میں "آدھا تیتر آدھا بٹیر" کی روایت کو توڑنے والا آخری روایت شکن، جاسوسی ناول نگاری کو ادب کے درجے پر فائز کرنے والا آخری ادیب، جس کے بعد نقالی میں اس کے "سینکڑوں ہم شکل" پیدا ہوئے، اور...

آخر میں، لاکھوں قارئین کا آخری "محبوب نرالے عالم" اسرار ناروی المعروف بہ ابن صفی، بی اے جس کے ناولوں کے عمیق مطالعے سے اس بات کا واضح انکشاف ہوتا ہے کہ اس کے پاس غزل کی زبان تھی اور پلاٹ و موضوعات کی رنگا رنگی اور ان کے تانے بانے پرونے میں طریق کار کی بوقلمونی جس نے، بقول ڈاکٹر خالد ان کے ناولوں کو ایک طویل اور حسین غزل میں تبدیل کر دیا تھا:

"ابن صفی نے دراصل زندگی بھر ایک ہی ناول لکھا ہے یا شاید دو ناول لکھے ہوں۔ ایک فریدی حمید کے کرداروں پر مشتمل اور دوسرا عمران پر۔ ان کی تحریریں دراصل ایک 'مہا کاویہ' یا ایک 'مہا بیانیہ' ہیں جو لگاتار پچیس برسوں تک قسط وار شائع ہوتا رہا... یہ چھوٹے چھوٹے ناول ہیں جو دراصل ایک لمبے سفر کے مختلف پڑاؤ ہیں۔ اس لیے میں، ان ڈھائی سو ناولوں کو ایک 'مہا بیانیہ' کے مختلف ابواب کا نام دے

رہا ہوں[1]۔"

ابن صفی ایک شاعر کا ذہن لے کر پیدا ہوئے تھے اور اپنے ناولوں میں بڑے بڑے سنگ دل مجرموں سے نبرد آزما ہونے کے باوجود سینے میں ایک نرم و نازک دل رکھتے تھے۔ فطرتاً وہ شاعر تھے مگر تقدیر اور حالات نے ان کو جاسوسی ناول نگار کے بطور شہرت دی۔ لیکن سراغ رسی پر کہانیاں رقم کرتے وقت ان کا شاعرانہ ذہن جاگتا رہتا تھا اور یقیناً ان کو اس بات کا بھرپور احساس رہتا ہوگا کہ وہ ایک نثری غزل تخلیق کر رہے ہیں۔ اس طرح انھوں نے نثر میں بھی نظم تخلیق کی ہے:

"سلاخوں کے پیچھے لڑکی موجود تھی لیکن حمید اس کی شکل نہیں دیکھ سکا کیونکہ وہ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی اور پھر جیسے ہی اس نے سر اٹھایا حمید کی آنکھوں میں بجلی سی چمک گئی۔ پہلی نظر میں کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا کہ وہ کتنی حسین تھی۔ دوسری نظر بھی تفصیلی جائزے کے لیے ناکافی تھی اور تیسری نظر کو اتنا ہوش کہاں کہ وہ تفصیل میں جاسکتی۔ حمید اس کی اداس آنکھوں میں کھو گیا۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ کسی سنسان مقام پر کھڑا ہو، خاموشی سے پرواز کرنے والے پرندوں کی قطاریں افق کی سرخی میں لہرا رہی ہوں اور کسی پرسکون جھیل میں شفق کے رنگین لہریئے آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں لیکن ان سب پر ایک خواب آگیں سی اداسی مسلط ہو[2]۔"

"...اس کے خواب بھی بڑے عجیب ہوتے تھے۔ اکثر وہ دیکھتی کہ وہ ہوا میں اڑتی پھر رہی ہے، بالکل پرندوں کی طرح... کبھی دیکھتی کہ اس کے سامنے صدہا میل تک ہرے بھرے جنگل پھیلے ہوئے ہیں اور وہ ہرنیوں کی طرح چھلانگیں لگاتی پھر رہی ہے، کبھی اسے ننھے ننھے میلے کچیلے بچوں کی فوج نظر آتی اور وہ ان کے درمیان کھڑی چیخ رہی ہوتی۔ حلق پھاڑ پھاڑ کر گا رہی ہوتی اور اس کا وجود خود ایک طویل سا قہقہہ بنتا ہوا نظر آتا[3]..."۔

"تالاب کے مرتعش سینے پر چاند کی کرنیں مچل رہی تھیں۔ فریدی چلتے چلتے رک گیا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دودھیا چاندنی اس کی بند اسی آنکھوں کی راہ سے روح کی گہرائیوں میں اترتی چلی جارہی ہو۔ نیند کے مارے دماغ کا سناٹا جنگل کے سکوت سے ہم آہنگ سا ہوتا معلوم ہو رہا تھا۔ ایک عجیب سی مدہوشی اس کے ذہن پر مسلط ہوتی جارہی تھی[4]..."۔

"تھوڑی دیر بعد بورازیانہ بھی غسل کر کے باہر نکل آئی۔ اب وہ پہلے سے زیادہ نکھر گئی تھی۔ اس کی گردن کی ایک ہلکی سی سلوٹ میں دو چار بال پھنسے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیوں حمید کے سینے میں کلبلاہٹ ہونے لگی[5]..."۔

"...کپکپاتی ہوئی دھوپ اونچے درختوں کی چوٹیوں پر آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی اور جنگل انواع و

اقسام کے شور سے گونجا ہوا تھا۔ کچے راستے کے دونوں طرف گھنی جھاڑیوں میں جھینگروں نے ریں ریں ٹیں ٹیں شروع کر دی تھی۔[6]"

"مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے چاندنی ہلکی تھی اور جنگل کے سناٹے سے اس کی ہم آہنگی بڑی دلکش لگ رہی تھی۔ حمید سوچ رہا تھا کہ اگر رفیق سفر، تنہائی نہ ہوتی تو اس وقت کیڈی کے پہیوں کے نیچے کی ناہموار زمین نہ جانے کتنے جہانوں کی سیر کرا دیتی۔ اس وسیع کائنات کے رشتے میں پروئے ہوئے دو دلوں کے کتنے راز فاش ہوتے بچے۔"

"وہ کیڈی سے اتر ہی رہا تھا کہ دفعتہً اس کی آنکھیں چوندھیا گئیں۔ اگر یہ تشبیہ گھٹیا اور پرانی نہ ہوتی تو وہ بھی سوچتا کہ وہ چہرہ سیاہ پردے کی اوٹ سے اسی طرح نکلا تھا جیسے بادل سے چاند نکل آئے۔ سفید سلک کا لبادہ ہلکورے لیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور اس لبادے کے اوپر سیاہ بل کھائے ہوئے گیسوؤں میں ایک خوابناک اور سلگتا ہوا چہرہ جس کے خدوخال آنکھوں میں گدگدی پیدا کر رہے تھے اور جب وہ برآمدے کی روشنی کی زد سے نکل کر روش پر اتر آئی تو دھندلی چاندنی میں گویا جان پڑ گئی۔[8]"

ان مثالوں کی روشنی میں نظر ڈالیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ناولوں کا کینوس جتنا وسیع تھا، ان کے عنوانات بھی اتنے ہی اچھوتے، متنوع اور شاعرانہ تھے جو جرم و سزا سے متعلق کہانیوں یا ناولوں کے عنوانات نہ ہو کر خوبصورت غزلوں اور رومانی ناولوں کے عنوانات محسوس ہوتے ہیں۔ ناول "گیارہ نومبر" کے پیش رس میں اپنی ایک پرستار کا حوالہ دیتے ہوئے وہ خود رقمطراز ہیں:

"گیارہ نومبر حاضر ہے۔ اس نام سے متعلق مجھے کئی خطوط بھی موصول ہوئے ہیں اور لوگوں سے زبانی بحث بھی ہوئی ہے۔ ایک صاحبہ نے کہا ہے نام سے قطعاً نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کوئی جاسوسی ناول ہے۔[9]"

ناولوں کی طرح ان کے عنوانات بھی ذہن پر کوئی بوجھ نہیں ڈالتے ہیں، اس کے برخلاف، ایک خوشگوار تاثر چھوڑتے ہیں اور پلاٹ کے ساتھ ان کا ربط بے حد مضبوط ہوتا ہے۔ ناولوں کے عنوانات کے انتخاب میں ان کو ید طولیٰ حاصل تھا جس کی ایک وجہ ان کے تخیل کی بلند پروازی بھی تھی، الفاظ کا مناسب استعمال، ترکیب کی معنویت و برجستگی اور معنی و مطالب کی وسعت نے ان کے عنوانات کو جاذب نظر و دلکش ہی نہیں بلکہ دلنشیں بھی بنا دیا ہے۔ ایک خوبصورت غزل کے عنوانات کی تمام خوبیاں ان میں موجود ہیں جو قوسِ قزح کی طرح حسین بھی ہیں۔ ابن صفی نے جہاں اپنے پلاٹ اور موضوعات میں روایتی تشبیہات اور استعارات اور فنی محاسن سے بھرپور استفادہ کیا ہے اور انہیں سلیقے سے برتا ہے وہیں نئے استعارے اور تشبیہات بھی وضع کی ہیں ان کا یہی وصف عنوانات میں بھی جھلکتا ہے اور اس طرح انہوں نے جاسوسی ادب میں نادر تشبیہات، استعاروں اور تراکیب کا استعمال کر کے ایک

مثال قائم کی ہے۔ بادی النظر میں تو وہ الفاظ کی بازیگری معلوم ہوتی ہے مگر غور کرنے پر ان کی معنویت پر حیرانی ہوتی ہے:

"...وہ آپ کی نرس ہے نا، بڑی ہی شوخ لپ اسٹک لگاتی ہے۔ ہونٹ دیکھ کر میں سوچنے لگا تھا یا اللہ کیا بلبل الٹ گیا ہے۔" (عمران) [10]

"ارے اس کی آنکھوں سے تو صبحیں طلوع ہوتی ہوں گی اور محرم کے گھاٹ سے پو پھٹتی ہوگی۔ گھنیری زلفوں میں شام ڈھلتی ہوگی..." (عمران) [11]

"ویسے جین اور جیکٹ میں بڑی اچھی لگتی ہو۔ پیچھے سے دیکھو تو ایسا لگتا ہے جیسے ہلال لٹک رہے ہوں۔" (عمران) [12]

"...یہ عورت ہے یا چاندی کی جھیل، اس کی زبان اس کے منہ میں اس طرح حرکت کرتی ہے جیسے سمندر میں بجرہ..." (عمران) [13]

"ہرگز نہیں آنے دوں گا کیوں کہ اس نے مجھے آبنوس کا کندۂ ناتراش کہا تھا" (جوزف)

"ارے تو بھی اسے مکھن کا پہاڑ کہہ کر معاف کر دے۔" (عمران) [14]

قدرت نے ان کے قلم کو ایک منفرد جولانی اور دل نشیں انداز عطا کیا تھا۔ اگر ان کی تحریریں سلاست و روانی کا عمدہ نمونہ پیش کرتی ہے تو ان کے عنوانات اپنے اندر شہد کی شیرینی اور تیر و نشتر کی کاٹ بھی رکھتے ہیں۔ انھوں نے قلم کو ڈبو کر تو لکھا ہی مگر خود بھی ڈوب کر لکھا۔

ان کے زیادہ تر عنوانات میں صنعت تضاد دکھائی دیتی ہے جس کی واضح مثالیں "بے گناہ مجرم"، "عظیم حماقت"، "پیاسا سمندر"، "ظلمات کا دیوتا"، "دلچسپ حادثہ"، "موت کا مہمان"، "پاگلوں کی انجمن"، "بزدل سورما"، "دست قضا"، "سمندر کا شگاف"، "معصوم درندہ"، "علامہ دہشت ناک"، "کالی کہکشاں"، "جنگل کی شہریت"، "بے چارہ شہزور" اور "خونی فنکار" وغیرہ ہیں۔

"بے گناہ مجرم" ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو نادانستگی میں کیے گئے قتل کے باوجود بے گناہ ہوتا ہے۔ عام طور پر الزام ثابت ہونے کے بعد ہی ملزم کو مجرم گردانا جاتا ہے اور اس کو سزا دی جاتی ہے مگر اپنے ناول "بے گناہ مجرم" میں انھوں نے عنوان سے ہی تحیر پیدا کیا ہے اور اسی کو موضوع بنا کر انہوں نے اسرار و رموز کی گتھیاں سلجھائی ہیں۔

ایک اور عنوان ہے "عظیم حماقت"۔ حماقت آدمی کی ایک منفی صفت ہوتی ہے مگر فاضل مصنف نے اس کے ساتھ "عظیم" کا استعمال کر کے ایک مثبت سوچ کی طرف اشارہ کیا ہے جو ان کے ایک مستقل کیریکٹر علی عمران کے کردار کا خاصا ہے۔ عمران جو اپنی حماقت آمیز حرکتوں کے بل پر بڑے سے بڑے

جرم کا پردہ فاش کرتا ہے، وہ عمران جس کا فلسفہ ہے کہ اس دنیا میں حماقت سے ہی امن وامان قائم رہ سکتا ہے۔ اس کے خیال میں زیادہ عقلمندی، چالاکی کی طرف لے جاتی ہے جو دراصل برائیوں کی جڑ ہے:

''آدمی سنجیدہ ہو کر کیا کرے جب کہ وہ جانتا ہے کہ ایک دن اس کو اپنی سنجیدگی سمیت دفن ہونا پڑے گا''۔۔۔ عمران۔[16]

''میں خواہ مخواہ اپنے ذہن کو تھکانے کا قائل نہیں ہوں، جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا اور میں تو اس کا عادی ہوں، میرے ملازم مجھے صبح سے شام تک بے وقوف بناتے رہتے ہیں''۔۔۔ عمران۔[17]

''... پھر کیا کروں، عقل مندوں کی زندگی جہنم بن جاتی ہے جو کچھ بھی گزرے چپ چاپ جھیلتے رہو، مگن رہو!''۔۔۔ عمران۔[18]

''جب سے آدمی کو اپنا ادراک ہوا ہے وہ اس کشمکش میں مبتلا ہے کہ اسے بے وقوف بننا چاہیے کہ نہیں۔ جو بے وقوف بننا نہیں پسند کرتے وہ زندگی بھر کڑھتے رہتے ہیں!''۔۔۔ عمران۔[19]

''ظلمات کا دیوتا''، ابن صفی کی معرکہ آرا بوغا سیریز کے سلسلے کا آخری ناول ہے۔ یہ سیریز ''عمران کا اغوا''، ''جزیروں کی روح''، ''چیختی روحیں''، ''خطرناک جواری'' اور ''ظلمات کا دیوتا'' پر مشتمل تھی اور جس میں انھوں نے بوغا کو متعارف کرایا تھا۔ بوغا جو وادئ ظلمات میں پوجا جاتا تھا۔ دیوتا جو علامت ہے حق وصداقت اور زندگی میں طمانیت کی اور جس کی پوجا سکون سے عبارت ہے، مگر ابن صفی نے صنعت تضاد کا خوبصورت استعمال کر کے اس کو وادئ ظلمات کا دیوتا تخلیق کیا ہے۔ ظلمات کی مناسبت سے شیطان یا ابلیس بھی لکھا جا سکتا تھا مگر انھوں نے روایت سے انحراف کرتے ہوئے اس عنوان میں ایک حسن پیدا کیا ہے۔

عام طور پر حادثے سے ایکسیڈنٹ مراد لی جاتی ہے۔ مگر یہاں بھی ان کا شاعرانہ مزاج آڑے آیا اور انھوں نے ناول ''دلچسپ حادثہ'' میں حادثے کے ساتھ دلچسپ کے سابقے کا استعمال کر کے پوری کہانی کو اس میں سمو دیا ہے جس کا احساس ناول ختم ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ ناول کی شروعات ہی عمران کی حماقت مآبی سے ہوتی ہے۔ اسی ناول میں انہوں نے ایک نفسیاتی کردار کو بھی متعارف کرایا ہے جو ذہن پر ان مٹ نقش چھوڑتا ہے اور وہ ہے کبڑا جو اپنی حرکتوں اور حماقتوں کی وجہ سے ایک عجیب وغریب اور پیچیدہ کردار ہے، وہ کبھی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا نظر آتا ہے تو کبھی غنڈوں سے مار کھاتا ہے اور کبھی شاندار سوٹ میں ملبوس دنیا کا عظیم ترین اکاؤنٹنٹ بن کر رانی ساجد نگر کے شوہر کی شکل میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے، جس نے اپنے لیے ''ہمبگ دی گریٹ''، ''ایڈیونکر سی'' اور ''ہیسر ڈلس'' جیسے غیر اہم القاب پسند کیے ہیں۔ یہ بے مثال القاب بھی ابن صفی ہی تخلیق کر سکتے تھے۔

کون ہے جو موت کا مہمان بننا پسند کرے گا مگر ''ڈاکٹر دعا گو'' سیریز کے دوسرے ناول ''موت کا مہمان'' میں مصنف نے عمران پر منڈلاتے موت کے سایوں کی مناسبت سے اس کو ''موت کا مہمان'' نام دے کر سرورق سے ہی تجسس کی فضا تیار کی ہے۔

اسی طرح ''بزدل سورما'' اور ''معصوم درندہ'' کے عنوانات بھی صنعت تضاد کی بہترین مثالیں پیش کرتے ہیں۔

''بے چارہ شہ زور'' مربوط پلاٹ اور نفسیاتی کردار کی ایک خوبصورت کہانی ہے جس کی ابتدا میں شہ زور کی زورآوری ظاہر نہیں ہوتی ہے مگر اختتام پر فاضل مصنف نے مجرم کی شہ زوری کے ساتھ ساتھ اس کی بے چارگی کا بڑا ہی خوبصورت تانا بانا بنا ہے جو دل پر ایک غم آلود تاثر چھوڑ جاتا ہے اور قاری کو مجرم سے ہمدردی اور اس کے جرم سے نفرت محسوس ہونے لگتی ہے۔ ایسی کردار نگاری صرف ابن صفی کا ہی خاصا ہو سکتی ہے:

''اس شخص کے لیے میرا دل رو رہا ہے۔ کاش اس کے انتقامی جذبے نے انفرادی رنگ اختیار کرنے کے بجائے ایسی تحریکوں کا ساتھ دیا ہوتا جو ظلم اور جبر کے نظام کو مٹا دینے کے لیے کام کر رہی ہیں۔'' عمران۔[20]

دست شفا کے وزن پر ابن صفی نے ''دست قضا'' کی اصطلاح وضع کی ہے۔ اس طرح کی اصطلاحات کا استعمال ان کا مخصوص انداز ہے۔ مثلاً ''آب وفات''، ''صنعت مستول الجہاز''، ''شب دیجور''، ''پٹلو زدہ'' وغیرہ۔

علامہ اور فنکار کے کردار سماج کے قابل احترام اور باوقار اراکین میں شمار کیے جاتے ہیں مگر ''علامہ دہشت ناک'' اور ''خونی فنکار'' میں بھی انہوں نے علامہ کے ساتھ دہشت ناک اور فنکار کے ساتھ خونی کے سابقوں کا استعمال کر کے ناول کے عنوانات میں کافی وزن پیدا کیا ہے جس سے قاری کی توجہ خود بخود اس کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔

ناول ''لاشوں کا آبشار'' کے اختتام پر گروہ کا سرغنہ 'مسٹر کیو' خود اپنے ہی گروہ کے اراکین کو قتل کر کے چھت سے پھینکتا ہے۔ فاضل مصنف نے قتل وخون کے اس منظر کو کوئی خونیں نام دے کر سنسنی پیدا نہیں کی ہے۔ وہ اپنے اختیار کردہ متنوع اسلوب اور ڈگر سے کیسے پیچھے ہٹ سکتا تھا لہٰذا اس نے اس کو آبشار سے تشبیہ دے کر ندرت پیدا کی ہے۔

ابن صفی نے بعض جگہ محاوروں سے بھی کافی فائدہ اٹھایا ہے۔ مثلاً ایک محاورہ ہے آسمان میں تھگلی لگانا جو ناممکن کو ممکن بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی محاورے کو ذہن میں رکھ کر انھوں نے اپنے ایک

ناول ''سمندر کا شگاف'' کا نام تجویز کیا ہے۔ پانی میں شگاف ڈالنا ناممکن ہے۔ یہاں صنعت تضاد کے بجائے صنعت مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔

کہکشاں سے سفیدی، دودھیا پن اور پاکیزگی کا احساس ابھرتا ہے مگر ابن صفی نے ناول ''کالی کہکشاں'' میں ایک عمارت تعمیر کر کے اسی کو موضوع بنایا ہے۔ اس میں ''کالی'' کو جرائم کی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے کیوں کہ یہ عمارت جرائم کی آماجگاہ تھی۔

آیئے کچھ اور عنوانات کا جائزہ لیتے ہیں جن میں ''دلیر مجرم''، ''لاشوں کا آبشار''، ''گیتوں کے دھماکے''، ''برف کے بھوت''، ''اندھیرے کا شہنشاہ''، ''شعلوں کا ناچ''، ''سائے کی لاش''، ''لاش کا قہقہہ''، ''طوفان کا اغوا''، ''رائفل کا نغمہ''، ''ٹھنڈی آگ''، ''لاش کا بلاوہ''، ''چاندنی کا دھواں''، ''بے چارہ/بے چاری''، ''اونچا شکار'' وغیرہ شامل ہیں۔

''دلیر مجرم'' ان کی پہلی کامیاب کاوش تھی جو ان کی زندگی کا سب سے بڑا چیلنج بن کر سامنے آئی تھی جس سے وہ بڑی کامیابی کے ساتھ نبرد آزما ہوئے اور جاسوسی ادب میں ایک نئی روش کی بنیاد ڈالی۔ ابن صفی نے اپنی پہلی کاوش کو ''دلیر مجرم'' کا عنوان دے کر اس میں حسین تضاد پیدا کیا ہے۔

گیت اور موسیقی سے نہ صرف ذہن بلکہ روح کو تسکین حاصل ہوتی ہے مگر انہوں نے اپنے ایک ناول ''گیتوں کے دھماکے'' میں آلۂ موسیقی کو ہی آلۂ قتل کی طرح استعمال کر کے قاری کو متحیر کیا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار سماجی ہونے کے ساتھ ساتھ فلمی بھی ہے جو موجودہ فلمی ماحول کی گھٹن پر طنز کرتا نظر آتا ہے:

شرابی کو تو لوگوں نے چھوڑ دیا تھا۔ وہ بھی اب ہیروئن کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ حمید، رمیش اور شلی الگ کھڑے تھے۔

''آؤ چلیں!'' رمیش آہستہ سے بولا۔ ''اس کتا خصی کی توقع نہیں تھی۔ میں اب نہیں آؤں گا۔ دیکھتا ہوں سالا کیا کر لیتا ہے۔'' وہ تینوں کمرے سے باہر نکل آئے۔

''یہ روز کا دھندہ ہے حمید صاحب!'' رمیش کہہ رہا تھا۔ ''جب تک انڈسٹری پر جاہل اور کمینے قسم کے لوگ چھائے رہیں گے، یہی ہوتا رہے گا۔ جنہیں علم کی دولت ملی ہے وہ ذہین ہیں، ان کے پاس پیسہ نہیں ہے''۔ [۱۲]

''برف کے بھوت'' اپنے آپ میں ایک نیا آئیڈیا ہے جو اس کے نام سے ہی ظاہر ہے۔ یہ ناول نہ صرف تحیر اور سنسنی بلکہ اپنی رومان انگیز فضا کی وجہ سے ان کے مشہور و معروف ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔

ان کا ایک اور ناول تھا بے چارہ/بے چاری جو موضوع اور منفرد لب و لہجے کی وجہ سے اپنا الگ مقام

رکھتا ہے۔ اپنے پہلے ایڈیشن میں اس کا نام بے چارہ رری لکھا گیا تھا جو عنوان کی پیش کش کے لحاظ سے بھی منفرد تھا۔

ایک دوسرے زاویے سے نگاہ ڈالی جائے تو واضح ہوگا کہ ابن صفی نے بعض ناولوں کے عنوانات کو ان کی کہانیوں سے اخذ کیا ہے اور ان کو کہانی سے جوڑنے کے لیے کسی ڈائیلاگ کا سہارا لیا ہے، یا ان کو براہ راست لکھا ہے۔ یہ زاویہ مندرجہ ذیل کچھ مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے:

''وہ سب دم بخود کھڑے تھے اور ان کی پرچھائیاں ایسی لگ رہی تھیں جیسے دیواروں پر موت کے 'تاریک سائے' جم گئے ہوں۔''[22]

''پہلے میں یہ سمجھ رہا تھا کہ ہمارے کسی دشمن نے ہمارے خلاف کسی 'سازش کا جال' پھیلایا ہے۔'' (حمید)[23]

''تم بہت ذہین اور دلیر ہو، میں اسے تسلیم کرتا ہوں۔'' سنگ ہی مسکرا کر بولا۔'' جب بھی میں اس سفر کے حالات لکھنے بیٹھوں گا تو مجھے تمہاری یاد بے حد ستائے گی۔ میں ان بگولوں کا تذکرہ 'خونی بگولوں' کے نام سے کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن اب مجھے لکھنا پڑے گا کہ فریدی کی ذہانت نے انہیں آتشی بگولے بنا دیا تھا۔''[24]

''دوسری طرف صحن کے پختہ فرش پر گویا 'خون کا دریا' بہہ رہا تھا۔ بے شمار لاشیں پڑی ہوئی تھیں جن میں اس کے ساتھیوں کی بھی لاشیں شامل تھیں۔''[25]

''دفعتاً اس کی نگاہ نیچے وادی میں رینگ گئی، سینکڑوں فٹ کی گہرائی میں چاندی کا چمک دار چشمہ پھوٹ رہا تھا۔ پھر یک بیک اس کی دھار اوپر اٹھی۔ اٹھتی ہی چلی گئی اور اندھیرے میں اس نے ایک چمک دار منارے کی شکل اختیار کر لی جو زمین و آسمان کو ملا رہا تھا۔ نیچے پھیلی ہوئی تاریکی میں اس چمک دار منارے کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔''

''میرے خدا۔'' حمید بڑبڑایا۔'' یہ 'چاندنی کا دھواں' ہے یا اندھیرے کی داڑھی۔''[26]

''تم نے دیکھا اپنے ساتھی کو۔ اس نے اس پہاڑ جیسے آدمی کو سچ مچ مار ڈالا۔ اب تم اسے 'دیو پیکر درندہ' کہہ سکتے ہو۔'' ڈاکٹر ٹسڈل بولا۔[27]

''خبر میں یہ بھی تھا کہ اے بی سی ہوٹل کے سامنے ویرانے میں اس 'بھیانک آدمی' کی حکومت ہے...''

''اسے پولیس کا بھی خوف تھا اور وہ 'بھیانک آدمی' تو تھا ہی۔ سارا دن گزر گیا لیکن عمران نہیں آیا۔ اس کو یقین تھا کہ عمران کسی نہ کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ یا تو وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا! یا پھر اس 'بھیانک آدمی' کے۔ وہ اس خیال سے ہی کانپ اٹھی۔ اس کے تصور میں عمران کی لاش تھی۔''[28]

"سمندر کا پھوڑا.. آج پھر بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ لیکن اب وہ سمندر کا پھوڑا نہیں کہلاتا تھا۔ اس کے مختلف نام تھے۔ نوجوانوں میں وہ 'لڑکیوں کا جزیرہ' کے نام سے مشہور تھا۔ ویسے سرکاری کاغذات میں وہ سمندر کا پھوڑا ہی کہلاتا تھا۔ انگریزوں نے اسے یہ نام دیا تھا۔ صدہا سال کے ویران جزیرے پر رنگ و نور کا طوفان سا آ گیا تھا! شاید ہی کوئی ایسا درخت باقی رہا ہو جس پر رنگین برقی قمقمے نظر نہ آتے ہوں! مائیکروفون فضا میں موسیقی منتشر کر رہا تھا اور زمین پر حسن کی مورتیں متحرک نظر آ رہی تھیں! اور یہ سچ مچ اس وقت 'لڑکیوں کا جزیرہ' معلوم ہو رہا تھا۔" [۲۹]

"لندن 'لاشوں کا بازار' بن گیا تھا۔ اتنا زبردست کشت و خون امن کے زمانے میں شاید ہی کبھی ہوا ہو۔ کم از کم تاریخ تو اس بارے میں خاموش ہی تھی۔ البتہ لوگوں کا خیال تھا کہ لندن کی عظیم آتشزدگی کے بعد یہ دوسرا ہیجان آفریں واقعہ تھا۔" [۳۰]

"پلازا میں پروگرام ہو رہے ہیں۔ آج کے خصوصی پروگرام کا نام 'جہنم کی رقاصہ' ہے۔ مورنیا کا مشہور ترین رقص ہے۔ یورپ میں اسے خاص مقبولیت حاصل ہوئی ہے... وہ آگ میں ناچتی ہے۔" عمران کچھ نہ بولا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔" [۳۱]

"مگر یہ 'قبر اور خنجر' کا اسکنڈل بھی خوب رہا..." سر سلطان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ویسے تم نہ ہوتے تو یہ کیس کسی سے سنبھل بھی نہ سکتا۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ تم میبی بڈفورڈ والی لائن سے کس طرح ہٹ گئے تھے؟" [۳۲]

اس کے علاوہ، ابن صفی نے کچھ دیگر ناولوں میں لطیف سا اشارہ کر کے قاری پر چھوڑ دیا ہے۔ کہ وہ خود ہی ان کا تعلق کہانی سے قائم کرے:

"فریدی نے اسے شعلوں کی بوچھار پر دھکیل دیا۔ شمشاد نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن فریدی کی ٹھوکر اس کی پیشانی پر پڑی اور وہ کتوں کی طرح حلق پھاڑتا ہوا وہیں ڈھیر ہو گیا اور دوسرے ہی لمحے میں جلتے ہوئے گوشت کی بو کمرے میں پھیلنے لگی۔ اس کی لاش پر 'شعلے رقص' کر رہے تھے اور فریدی قریب ہی کھڑا ہانپ رہا تھا۔" [۳۳]

"اونچا شکار" بھی ایک ایسا ہی عنوان ہے جس کے تحت منشیات کی اسمگلنگ پر تحریر کردہ ایک ایسی کہانی ہے جس میں ڈگر سے ہٹ کر مجرم کو کیفر کردار تک پہونچایا گیا ہے۔ یہ ناول عام فہم الفاظ کے ساتھ، رفتارِ واقعات، مزاح، رومان، استعجاب اور تسلسل کا ایک خوبصورت مرقع ہے۔ واقعات کے الجھاوے قاری کو ایسی وادیوں میں لے جاتے ہیں جہاں بقول عباس حسینی "تخیل کے پر جلتے ہیں اور فکر کی کلاہ کج ہوتی ہے"۔ [۳۴]

"پورے کمرے میں صرف ایک ہی بڑی تصویر تھی مگر دیوار پر الٹی لٹکی ہوئی یعنی صاحب تصویر کا سر نیچے اور ٹانگیں اوپر۔" [۳۵]

"اس دانت کا زہر تم پر کیوں نہیں اثر انداز ہوتا۔" فریدی نے پوچھا۔

"میں خود بھی زہریلا ہوں۔ نشے کے لیے سنکھیا استعمال کرتا ہوں۔" پرمود نے قہقہہ لگایا۔ [۳۶]

"تمہاری مشینی آندھیوں کے شکار دو دیہاتیوں کے بھوت۔" فریدی نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"مشینیں تم نے برباد کر دیں۔" ولیمن ٹوٹی ہوئی مشینوں کی طرف اشارہ کر کے بولا.... "یہی مشینیں آندھیاں پیدا کرتی تھیں۔ یہی مشین ان لوہے کے آدمیوں کی آنکھ تھی۔" [۳۷]

"کوئی بات نہیں، یہ لوہے والا پھاٹک کیا بلا ہے؟" (عمران)

"ایک عمارت کا پھاٹک جو استعمال میں نہیں ہے۔ اس کے صحن میں اچھا خاصا جنگل اگ آیا ہے۔ ادھر پچھلے پندرہ دنوں سے وہاں عجیب قسم کی آوازیں آنے لگی ہیں۔ رات گئے لوہے کا پھاٹک اس طرح ہلنے لگتا ہے جیسے کوئی آدمی ہلا رہا ہو۔" (شاہدہ) [۳۸]

"تیمور اینڈ باٹلے کی فرم سانپ کی کھالوں کی تجارت کرتی تھی۔ کاروبار بہت بڑا تھا۔ دفتر میں درجنوں کلرک تھے۔ مختلف شعبوں کے منیجر الگ الگ تھے اور ان کی تعداد بارہ سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ تین درجن شکاری تھے جن کے ذمہ سانپوں کی فراہمی کا کام تھا۔" [۳۹]

"رستمبا پہلوانوں کا شہر تھا۔ اگر اکبر آباد بگڑ کر آگرہ ہو سکتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ رستم آباد بھی کثرت استعمال سے گھس کر رستمبا نہ رہ جاتا۔ لیکن اس کہانی کا تعلق شہر کے نام سے نہیں ہے۔ اگر اس کا نام رستمبا نہ ہوتا تب بھی وہ پہلوانوں کا ہی شہر ہوتا کیونکہ یہاں پہلوان بکثرت پائے جاتے تھے اور سردیوں کا موسم جیسے ہماری بستیوں میں مشاعروں کی وبا لے کر آتا ہے اسی طرح وہاں موسم بہار سارا کا سارا اکھاڑوں کی نظر ہو جاتا تھا۔" [۴۰]

ان کے علاوہ "سہمی ہوئی لڑکی"، "طوفان کا اغواء" وغیرہ بھی ایسے ہی ناولوں میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔

ادب اور سائنس میں حد فاصل ہے، کیوں کہ سائنس جہاں حقائق کی بات کرتی ہے وہیں ادب تخیل سے عبارت ہے مگر ابن صفی نے اس بُعد کو اپنی سائنسی و علمی بصیرت نیز عمیق مشاہدے کی بدولت ختم کیا۔ جن کی خوبصورت مثالیں "شعلوں کا ناچ"، "چمکیلا غبار"، "برف کے بھوت" وغیرہ عنوانات کی تحریر کردہ کہانیاں ہیں۔ انہوں نے ہر ناول میں زمانے کی رفتار پہچان کر سماج کے کسی نہ کسی مسئلے کو چھیڑا ہے۔ پھر بھی ان کو وہ شناخت نہیں ملی جس کے وہ مستحق تھے۔ اردو ادب کے ماہرین نے ان کے

شاہکاروں کوادبی درجہ دینے کے لیے قابل ہی نہیں سمجھا لیکن قارئین نے ان کو سرآنکھوں پر بٹھایا۔تو کیاان کے قارئین کی سمجھ اور پرکھ کو ناقدین سے اہم گردانا جائے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب مثبت ہے۔کیوں کہ ناقدین مروجہ گھسے پٹے پیمانوں پر کسی مصنف کی عظمت اوراہمیت کو ناپتے ہیں جب کہ قاری کے نزدیک مقبولیت ہی سب سے بڑا پیمانہ ہے۔کہا جاتا کہ بائبل اور شیکسپیئر کے بعد سب سے زیادہ بکنے والی تخلیقات اگاتھا کرسٹی کی ہیں۔اس نظریئے سے دیکھا جائے تو ابن صفی کی تخلیقات کی فروخت بھی ان سے کسی طرح کم نہیں ہوگی۔اسرار نے بھی اپنے عظمت کے دعوے پر اصرار نہیں کیا جب کہ قاری ہی اس پر مصر رہا کیوں کہ اسرار، تا حیات اپنے قلم کی ''لذت زیست''[۴۱] اور ''متاع قلب ونظر''[۴۲] ان پر لٹاتا رہا۔ابن صفی کی اہمیت یہ نہیں ہے کہ انھوں نے تقریباً تین دہائیوں تک لاکھوں دلوں پر حکومت کی اور تین نسلوں کی ذہن سازی وکردار سازی کی بلکہ ان کی اہمیت یہ ہے کہ وہ آج بھی موجودہ نسلوں کے ذہنوں کی آبیاری کررہے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔وہ '' دشمنوں کے شہر'' میں تنہا ہوتے ہوئے بھی تنہا نہیں تھے بلکہ ان کے ساتھ سماج کے ہر طبقے کے لاکھوں پرستار تھے یہی اٹل حقیقت، ادب کے ثقہ حضرات سے ان کی چشمک اور حسد کی وجہ رہی ہے۔

حوالہ جات:

۱ ڈاکٹر خالد جاوید۔''ابن صفی : چند معروضات'' سہ ماہی اردو ادب، دہلی، شمارہ اپریل تا جولائی 2006

۲ خونخوار لڑکیاں، جاسوسی دنیا، الٰہ آباد، جولائی 1956

۳ پیاسا سمندر، جاسوسی دنیا، الٰہ آباد، نومبر 1957

۴،۵،۶ خون کا دریا، جاسوسی دنیا، الٰہ آباد، نومبر 1953

۷،۸ لاشوں کا آبشار، جاسوسی دنیا، الٰہ آباد جون 1954

۹ پیش رس گیارہ نومبر، کراچی، 14 جنوری 1969

۱۰،۱۱،۱۲ گھر کا بھیدی، جاسوسی دنیا، الٰہ آباد جون 1964

۱۳،۱۴،۱۵ موت کا مہمان، جاسوسی دنیا، الٰہ آباد جولائی 1964

۱۶ کالی تصویر، جاسوسی دنیا، الٰہ آباد، دسمبر 1957

۱۷،۱۸،۱۹ علامہ دہشت ناک، جاسوسی دنیا، الٰہ آباد فروری 1976

۲۰ بے چارہ شہ زور، جاسوسی دنیا، الٰہ آباد اپریل 1976

۲۱ گیتوں کے دھماکے، جاسوسی دنیا الٰہ آباد، اگست 1954

۲۲۔ تاریک سائے، دوسرا ایڈیشن، جاسوسی دنیا، الٰہ آباد، جولائی 1973
۲۳۔ سازش کا جال، جاسوسی دنیا، الٰہ آباد، اکتوبر 1955
۲۴۔ خونی بگولے، جاسوسی دنیا، الٰہ آباد، جنوری 1966
۲۵۔ خون کا دریا، دوسرا ایڈیشن، جاسوسی دنیا، الٰہ آباد، مئی 1971
۲۶۔ چاندنی کا دھواں، دوسرا ایڈیشن، جاسوسی دنیا، الٰہ آباد، جنوری 1974
۲۷۔ دیو پیکر درندہ، جاسوسی دنیا، الٰہ آباد، ستمبر 1967
۲۸۔ بھیانک آدمی، دوسرا ایڈیشن، جاسوسی دنیا، الٰہ آباد، اپریل 1975
۲۹۔ لڑکیوں کا جزیرہ، جاسوسی ادب، کتابی سلسلہ 3 (سفاک مجرم)، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، اپریل 2004
۳۰۔ لاشوں کا بازار، جاسوسی ادب، کتابی سلسلہ 3 (سفاک مجرم)، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، اپریل 2004
۳۱۔ جہنم کی رقاصہ''، نکہت پاکٹ بکس، الٰہ آباد، جنوری 1975
۳۲۔ قبر اور خنجر، ماہنامہ نکہت، الٰہ آباد، ستمبر 1972
۳۳۔ شعلوں کا ناچ، نکہت پاکٹ بکس، نکہت پبلیکیشنز، الٰہ آباد، فروری 1974
۳۴۔ اونچا شکار، جاسوسی دنیا، الٰہ آباد، جولائی 1958
۳۵۔ الٹی تصویر، دوسرا ایڈیشن، جاسوسی دنیا، الٰہ آباد، مئی 1981
۳۶۔ زہریلا آدمی، جاسوسی دنیا، الٰہ آباد، فروری 1960
۳۷۔ موت کی آندھی، دوسرا ایڈیشن، جاسوسی دنیا، الٰہ آباد، جون 1981
۳۸۔ آہنی دروازہ، دوسرا ایڈیشن، ماہنامہ نکہت، الٰہ آباد، اپریل 1971
۳۹۔ سانپوں کے شکاری، نکہت پاکٹ بکس، الٰہ آباد، فروری 1975
۴۰۔ لڑاکوں کی بستی، جاسوسی دنیا، الٰہ آباد، فروری 1959
۴۱۔ مشتاق احمد قریشی، تلاش جدید، نئی دہلی اگست 1989
۴۲۔ اسرار ناروی۔ تلاش جدید، نئی دہلی اگست 1989

☆ ادریس احمد خان، قلمی نام ادریس شاہجہانپوری (اسسٹنٹ ڈائریکٹر، نیوز)، دوردرشن، نئی دہلی۔
موبائل: 09711700720 Email: iahmadk@gmail.com

ابن صفی سے ایک مخاطبہ عالم خیال میں

مرتب: ڈاکٹر غضنفر اقبال

اسرار ناروی المعروف بہ ابن صفی شہرت، مقبولیت، ریڈر شپ کے اعتبار سے غیر معمولی سحر طراز فن کار تھے۔ ان کے جاسوسی سنسار نے اردو ادب کو مخرب اخلاق اور فحش لٹریچر سے نجات دلائی۔ ان کی ادبی اور دلچسپ تحریروں نے خاصان ادب کو متوجہ و متاثر کیا۔ جاسوسی فکشن کے زمانہ شناس ادیب ابن صفی 'سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا' کے مصداق، قلوب اور اذہان پر آج بھی حکومت کر رہے ہیں۔ بقول شاہد جمیل:

تمام لوگ فریدی، حمید جیسے ہیں
یہ شہر ابن صفی کی کتاب لگتا ہے

'ایک مخاطبہ عالم خیال میں' اسرار ناروی یا ابن صفی سے کیا گیا ایک خیالی انٹرویو ہے جسے جواں سال محقق ڈاکٹر غضنفر اقبال نے باذوق قارئین کی نذر کیا ہے۔ ابن صفی کا جواب خود ان کے اشعار کی روشنی میں ہے۔ (ع.ا.)

غضنفر اقبال: آپ کے والد صفی اللہ اور والدہ نضیرو بی بی نے آپ کا نام اسرار احمد رکھا تھا۔ لیکن آپ نے اسرار ناروی، ابن صفی اور طغرل فرغان کو مناسب جانا، کیوں؟

ابن صفی: روح کو جسم کے ویرانے میں گم رہنے دے = جی بہلانے کے لیے کم تو نہیں ہیں خدوخال

غ الف: آپ کے نزدیک زندگی؟

ابن صفی: زندگی دار و رسن سے بھی جلا پاتی ہے = چھوڑیے زلف کے قصے لب و رخسار کی بات

غ الف: آپ تین برس پیشہ معلمی سے وابستہ رہے، آج کا معلم آپ کی نظر میں؟

ابن صفی: تنہائی ہی تنہائی ہے کیسے کہیں کیسے سمجھائیں = چشم و لب و رخسار کی تہہ میں روحوں کے ویرانے ہیں

غ الف: آپ نے اپنی شاعری میں کون سا فلسفہ بیان کیا ہے؟

ابن صفی: بالآخر تھک ہار کے یارو ہم نے بھی تسلیم کیا = اپنی ذات سے عشق ہے سچا باقی سب افسانے ہیں۔

غ الف: آپ نے 250 سے زائد ناول تحریر کیے کیا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ایسی بات رہ گئی ہے جس کو آپ بیان نہیں کر سکے؟

ابن صفی: جو کہہ پائے وہی ٹھہرا ہمارا فن اسرار = جو کہہ نہ پائے جانے وہ کیا بات ہوتی

غ الف: ناول کیا ہے؟

ابن صفی: فروغ آتشِ گل ہی چمن کی ٹھنڈک ہے = سلگتی چیختی راتوں کو بھی تو شبنم آئے

غ الف: کہا جاتا ہے کہ جاسوسی ادب کا آغاز مشہور داستان الف لیلیٰ سے ہوا، کیا اُس داستان کے اسرار آپ کے قلب و دماغ نے قبول کیے؟

ابن صفی: دل سے دماغ و حلقۂ عرفاں سے دار تک = ہم خود کو ڈھونڈتے ہوئے پہنچے کہاں کہاں

غ الف: اپنے تخلیق کردہ کردار کرنل فریدی، کیپٹن حمید، عمران، قاسم، جوزف، جولیا، انور اور رشیدہ کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

ابن صفی: اُف یہ تلاش حسن و حقیقت کس جا ٹھہریں جائیں کہاں صحن چمن میں پھول کھلے میں صحرا میں دیوانے ہیں

غ الف: مشہور انگریزی ادیب آرتھر کانن ڈائل (Arther Conan Doyle) نے اپنے ناول میں شرلاک ہومز جیسا لازوال کردار تخلیق کیا تھا۔ آپ نے شرلاک ہومز سے متاثر ہو کر فریدی کے کردار کو تخلیق کیا۔ کیا اس میں صداقت ہے؟

ابن صفی: قفس کی داستاں ہے اور ہم ہیں = اشاروں کی زباں ہے اور ہم ہیں

غ الف: جدید ادبی شعور کے رسالے 'شب خون' کے اولین مدیر ڈاکٹر سید اعجاز حسین کے آپ شاگردِ رشید رہے۔ آپ کے اُستادِ محترم زندگی بھر اس بات سے متاسف رہے کہ آپ نے اسرار ناروی کو قتل کر دیا۔ استادِ مکرم کی اس بات پر آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

ابن صفی: وہ جس کا سایہ گھنا گھنا ہے = بہت کڑی دھوپ جھیلتا ہے

غ الف: بقول آپ کے "ترقی پسندوں نے بے حد وقیع سرمایہ چھوڑا ہے البتہ ان کے سیاسی افکار سے کم از کم مسلمان متفق نہیں ہو سکے" کن وجوہات کی وجہ سے متفق نہیں ہو سکے؟

ابن صفی: کیوں حرم میں یہ خیال آتا ہے = اب کسی دشمنِ دیں سے ملیے

غ الف: تعدد ازدواج کے آپ کے قائل رہے ہیں، کوئی خاص وجہ؟

ابن صفی: مہ جبینوں نے کسی کام کا نہ چھوڑا ہمیں = چاند چڑھتا ہے تو بن جاتا ہے جی کا جنجال

غ الف: آج دنیا خوں آشام منظر سے گزر رہی ہے آپ کا کیا خیال ہے؟

ابن صفی: زمیں کی کوکھ ہی زخمی نہیں اندھیروں سے = ہے آسماں کے بھی سینے پہ آفتاب کا زخم

غ الف: آپ کی تحریروں کے کئی ادیب وشاعر عاشق رہے ہیں، آپ کے ایک عاشق، اردو نظم کے مصور شاعر پروفیسر صادق نے ایک انٹرویو میں کہا تھا ''میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی ناراضی کا خیال کیے بغیر شب خون مرحوم کے کم از کم دو درجن جدید افسانہ نگار، ابن صفی پر قربان کر سکتا ہوں'' مذکورہ بیان پر آپ کا کیا ردِ عمل ہے؟

ابن صفی: کہانی ختم ہوتی ہے نہ شب ہی = وہی معجز بیاں ہے اور ہم ہیں

غ الف: ہندوستانی ٹیلی ووڈ کے مشہور سیریئل C.I.D کے اے سی پی معروف مراٹھی اداکار مسٹر شیوا جی ساٹم نے ایک روزنامے پنجاب کیسری دلی کو انٹرویو دیتے ہوئے ابن صفی صاحب آپ کی عظمت کا اعتراف کیا تھا اور کہا کہ میرا کردار ''اُردو میں ابن صفی کے لکھے جاسوسی ناول سے Inspired ہے اور کرنل ہارڈ اسٹون سے ملتا جلتا ہے۔'' کیا آپ کو مسرت ہوتی ہے؟

ابن صفی: اور کوئی جو کرے بات تو ہم جاں دے دیں = آپ کے منہ سے بھلی لگتی ہے اغیار کی بات

غ الف: کیا یہ بات مبنی بر حقیقت ہے کہ آپ کی ہزاروں صفحات پر پھیلی تحریروں نے کئی نسلوں کی تربیت کی ہے؟

ابن صفی: ترا جنوں بھی نرالا ہے اسرار = کہ ذرہ ذرہ کو سورج بنا دیا تو نے

غ الف: عہد موجود کے اُردو قارئین کے لیے آپ کا پیغام؟

ابن صفی: عشق عرفاں کی ابتدا ہے = حسن منزل نہیں، راستہ ہے

☆ اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو، شری راجیو گاندھی ڈگری کالج، بسوا کلیان-585327، ضلع بیدر۔ (کرناٹک)

موبائل نمبر:09945015964

ڈپلومیٹ دانش ور

شکیل انجم

خدا بخشے محترم ابن صفی مرحوم کو کہ انہوں نے "ڈپلومیٹ مرغ" لکھ کر بہت سے متعلقین کو اپنے اپنے گریبانوں میں جھانکنے پر مجبور کر دیا تھا اور ہماری ناقص رائے میں گریبان کا مقصد وافادیت اس کے سوا اور کچھ ہے بھی نہیں کہ اسی میں جھانکا جائے مگر دوسروں کے گریبانوں میں! خواہ وہ منو بھائی کا گریبان ہو یا......
خیر چھوڑیے گریبانوں کے ذکر کو کہ اس میں بہت سے پردہ نشینوں کے نام آتے ہیں اور جب سے شریعت بل اسمبلی میں پاس ہوا ہے ہم پردے کے سختی سے قائل ہو گئے ہیں۔ یوں بھی تاک جھانک ہمارا شیوہ نہیں ہے۔ بلکہ ہم تو سرے سے گریبان ہی نہیں رکھتے کیوں کہ قمیص الٹی پہنتے ہیں۔ اب کوئی جھانکتا ہے تو جھانکتا رہے۔ کیونکہ اچھائی برائی بے چاری ریڑھ کی ہڈی میں تو ہوتی نہیں یہ چیز تو پسلیوں کے درمیان آگے کی جانب پھدکتی ہے۔ صاحبان عقل وفہم ہماری اس ترکیب سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ آزمائش شرط ہے۔

تو صاحبو! محترم ابن صفی کی تقلید میں ہم ڈپلومیٹ دانشور پیش کر رہے ہیں۔ مرحوم کی تقلید تو ان کی زندگی ہی میں بہت سے صاحبان علم وفن نے کی۔ یہاں تک کہ موصوف کو اپنی کتابوں کے اداریے میں بطور خاص اعلان کرنا پڑا کہ ہماری کتابیں خریدنے سے پہلے ہمارے نام (ابن صفی) میں نکتے، تشدید اور مد وغیرہ اچھی طرح دیکھ لیا کریں ایسا نہ ہو کہ آپ کے پیسے "عین غین" ہو جائیں۔

ہاں تو جناب، بات ہو رہی تھی ڈپلومیٹ دانشور کی کیونکہ بفضل خدا ہم بھی ایک عدد دانشور ہیں۔ ایک عدد کیا، ہمارے اندر تو دانشوری کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے جس میں لاتعداد دانشور تیر رہے ہیں۔ ہم جب چاہتے ہیں حلق میں ہاتھ ڈال کر ایک آدھ دانشور کی ٹانگ پکڑ کر باہر کھینچ لیتے ہیں اور خطہ ارض پاک پر دانشوری کے جوہر دکھانے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں ان میں سے بیشتر دارالخلافہ سدھار جاتے ہیں کہ دانشوروں کا اصل ٹھکانا وہی مقام بلند بالا ہے ان میں سے بہت سے تجزیہ نگار بن جاتے ہیں اور وہاں بیٹھ کر پیشگوئیاں فرماتے رہتے ہیں کہ کس کا دھڑن تختہ ہونے والا ہے، کون لندن یاترا کو جا رہا ہے، کون لندن یاترا سے واپس آ رہا ہے۔ کس کی چیف منسٹری عالم نزع میں ہے، کہاں گورنر راج قائم ہو رہا ہے، کب مارشل لاء لگ رہا ہے اور حکومت وقت کتنے دنوں کی مہمان ہے۔ وغیرہ وغیرہ...... اب اگر ان کے تجزیے غلط ثابت ہو جائیں تو قصور ان کا ہرگز نہیں ہے بلکہ ان ارباب اختیار کا جنہوں نے موصوف کے تجزیوں کے مطابق حالات پیدا نہیں کیے۔

خیر صاحب ان تجزیہ نگاروں کو جانے دیجیے، اب ہم اپنی ذات گرامی کی بات کرتے ہیں کچھ دن قبل

ہم ایک تقریب میں مدعو تھے نہ معلوم لوگوں کو کس طرح سن گن مل گئی کہ ہم دانشور ہیں اب کیا تھا چہار جانب سے ہماری طرف انگلیاں اٹھنے لگیں۔ لوگ گردن اچکا اچکا کر ہمیں دیکھنے لگے' آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورنے لگے غرض پورے مجمع میں ہلچل مچ گئی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ہمیشہ ہی ایسا ہوتا ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم عجیب الخلقت ہیں بلکہ یہ مقبولیت ہماری شہرت اور دانشوری کے باعث ہے کہ جہاں چلے جاتے ہیں تہلکہ مچ جاتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد کچھ لوگ دست بستہ ہماری خدمت میں حاضر ہوئے اور عاجزانہ درخواست کی کہ ڈائس پر قدم رنجہ فرمائیں اور اپنی دانشوری کے کرتب دکھائیں معاف کیجیے گا' جوہر دکھائیں۔ ہم چھوٹی موٹی مجالس اور کم علم لوگوں کے مجمع میں تقریر وغیرہ کرتے ہوئے اپنی ہتک محسوس کرتے ہیں۔ لہٰذا پہلے تو ہم نے انکساری کا اظہار کیا...... کچھ دیر انکار کیا کہ بڑے لوگوں کے یہی طور طریق ہوتے ہیں چنانچہ شاہانہ انداز میں چلتے ہوئے ڈائس پر پہنچے' مجمع پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور فرمایا۔

''حاضرین! سب سے پہلے تو یہ بتادیں کہ ہم محض دانش ور نہیں ہیں بلکہ ڈپلومیٹ دانشور ہیں۔ ہم حکومتی گتھیاں سلجھاتے ہیں۔ سیاسی جوڑ توڑ کرتے ہیں سفارتی توڑ پھوڑ کرتے ہیں کسی پارٹی کو اکھاڑتے ہیں' کسی پارٹی کو پچھاڑتے ہیں لیکن یہاں نہ کوئی پارٹی نظر آرہی ہے نہ پارٹی لیڈر۔ نہ حزب اقتدار ہے نہ حزب اختلاف! چنانچہ ان حالات میں ہم کیا دانشوری کی باتیں کریں اور کون انہیں سمجھے گا لہٰذا ایک چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں۔''

''ارشاد...... ارشاد...... ہر طرف سے آوازیں آئیں۔

''واقعہ یوں ہے'' ہم نے کہنا شروع کیا۔ ''بلکہ آپ تصور کر لیجیے کہ مہینے کی پہلی تاریخ ہے ایک غریب شخص صبح ہی صبح ملازمت پر جانے کے لیے گھر سے نکلا ہے' تیس دن کے طویل انتظار کے بعد آج تنخواہ ملنے والی ہے' وہ دل ہی دل میں جمع خرچ کا حساب لگا رہا ہے مگر خرچ ہی خرچ کی مدیں دکھائی دے رہی ہیں۔ جمع کی صرف ایک مد ہے اور وہ بھی اتنی مختصر کہ مہنگائی کی خوردبین سے دیکھنے پر بھی بالکل نظر نہیں آتی' بچی نے ننھی ننھی بانہیں گلے میں ڈال کر توتلی زبان سے گڑیا کی فرمائش کی ہے...... بیوی نے ننگے ہاتھوں کے لیے چوڑیوں کا کہا ہے اور دمہ کی مریض ماں نے اکھڑتی ہوئی سانس سے دواؤں کی سخت تاکید کر دی ہے۔

مجمع ہمہ تن گوش تھا۔

اور ہم کہہ رہے تھے......

وہ شخص دن بھر فیکٹری میں کام کرتا رہا اور دل ہی دل میں جمع خرچ کا حساب لگاتا رہا۔ شام کو ڈیوٹی ختم ہوئی تو وہ اکاؤنٹ برانچ کی طرف تنخواہ لینے چلا گیا۔ وہاں ایک طویل قطار تھی وہ بھی لائن میں لگ گیا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد اس کا نمبر آیا کیشیئر نے رجسٹر پر انگوٹھا لگوا کر مہینے بھر کی کمائی چند سو روپوں کی شکل میں اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ اس نے گنے بغیر نوٹ جیب میں ڈال لیے کیونکہ وہ اتنی تعداد میں نہیں تھے کہ انہیں دوبارہ گنا جاتا۔ بہرحال وہ فیکٹری سے باہر آ گیا اور بازار کی طرف چل دیا۔ اس نے سب سے پہلے بچی کے لیے گڑیا خریدی' پھر بیوی کے لیے چوڑیاں لیں' ماں کے لیے دوائیں بھی خریدیں اس کے بعد ضروریات زندگی کا سامان اور دال دلیا وغیرہ خریدا۔ تھیلا اب بھر گیا تھا اور پیسے بھی کافی خرچ ہو گئے تھے چنانچہ وہ بس اسٹاپ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ زبردست شور اور نعرے سنائی دیئے۔ ذرا دیر بعد فضا دھماکوں سے گونج اٹھی۔ دو سیاسی پارٹیوں کے نام نہاد کارکنوں کے درمیان تصادم ہو گیا تھا۔ گولیاں تڑاتڑ چل رہی تھیں۔ لوگ دھڑا دھڑ گر رہے تھے جیالے کارکن خود کار ہتھیاروں سے اندھادھند فائرنگ کر رہے تھے۔ ہر طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی اور میدان حشر جیسا شور بپا تھا۔

وہ شخص بھی اپنا وزنی تھیلا اٹھائے ایک جانب بھاگا اور بھاگتا چلا گیا۔ دوسری سڑک سے پولیس کی موبائل آ رہی تھی جو غالباً جائے واردات پر فائرنگ کے خلاف ایکشن لینے اور اس کے ذمہ داروں کو گرفتار کرنے بھیجی گئی تھی مگر اسی جانب سے گولیوں کی بوچھار آ رہی تھی اور تین گولیاں موبائل کی باڈی پر بھی لگی تھیں ان حالات میں موبائل کا وہاں تک پہنچنا مشکل تھا۔ ظاہر ہے وہاں موت کا رقص ہو رہا تھا اور پولیس والوں کے لیے آن ڈیوٹی ہوتے ہوئے کسی قسم کا رقص دیکھنے کی اجازت نہیں ہے کیونکہ رقص بہرحال رقص ہوتا ہے۔ خدا بخشے مرحوم جوش صاحب رقص کو اعضا کی شاعری کا نام دے چکے ہیں لہٰذا پولیس کے اہلکاروں کو ان لغویات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ فرائض منصبی ادا کرنے نکلتے ہیں انہیں اعضا کی شاعری وغیرہ سے کیا کام! خواہ وہ طبلے کی تھاپ کی تحریک پر ہو یا کلاشنکوف کی گولی لگنے سے آدمی ناچ اٹھا ہو جبکہ ناچ دیکھنا بری بات ہے۔

اسی وقت موبائل میں اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے افسر کی نظر اس شخص پر پڑی جو اپنا تھیلا اٹھائے بھاگا چلا جا رہا تھا۔ پولیس والے بڑے قیافہ شناس ہوتے ہیں' بڑی گہری نظر رکھتے ہیں چنانچہ انہیں شک گزرا اور اس کے بعد یقین ہو گیا کہ سارے فساد کی جڑ یہی شخص ہے۔ یہی بس میں چنگاری ڈال کر بھاگا ہے اور یہ کہ اس کے پھولے ہوئے تھیلے میں بم' بارود' ماؤزر' گولیاں اور نہ جانے کیا کیا بھرا ہو گا لہٰذا اس نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ موبائل اس شخص کے پیچھے لگا دی جائے اور اسے بہرصورت گرفتار کیا جائے کہ وہ دہشت گرد معلوم ہوتا ہے چنانچہ موبائل نے اس شخص کا تعاقب شروع کر دیا۔

اس شخص نے جو یہ صورت حال دیکھی تو سرپٹ دوڑنا شروع کر دیا کیونکہ وہ اپنے ملک کی پولیس کی

کارکردگی سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے موبائل کے ناپاک ارادے بھانپ لیے تھے۔ وہ اولمپک چیمپئن کی طرح بہت تیزی سے موبائل کے آگے آگے دوڑ رہا تھا اور موبائل کے ڈرائیور نے اس تک پہنچنے کے لیے ایکسی لیٹر پر پاؤں کا پورا دباؤ ڈال رکھا تھا۔

شخص مذکورہ نے موبائل کو قریب سے قریب تر ہوتے دیکھا تو ایک گلی میں گھس گیا۔ موبائل ایک پان کے کیبن سے ٹکرائی پھر وہ گلی میں گھس پڑی۔ وہ دوسری سڑک پر نکل آیا۔ موبائل بھی اس کے تعاقب میں دوڑی چلی آئی اس شخص نے اور تیز دوڑنا شروع کر دیا۔ موبائل بھی سڑک کے بخیے ادھیڑنے لگی۔ اس میں بیٹھے ہوئے سپاہی الرٹ ہو گئے تھے سب نے اپنی گنیں اس شخص پر سیدھی کر لی تھیں نگران کا افسر شاید اس دہشت گرد کو زندہ گرفتار کرنا چاہتا تھا۔

شخص مذکور بے تحاشا بھاگ رہا ہے۔ حال سے بے حال ہو گیا ہے۔ سانس بری طرح پھول گیا ہے۔ جسم پسینے میں شرابور ہے لیکن زندگی بچانے کی خواہش نے اس کے جسم میں بجلی سی دوڑا دی ہے۔ اس کے تصور میں سسکتی بلکتی بیمار ماں ہے جو چارپائی پر کراہتی ہوئی دوا کا انتظار کر رہی ہے۔ بیوی کی ننگی کلائیاں ہیں جو چوڑیوں کے بغیر ویران ہیں۔ معصوم بچی کی امید بھری نظریں ہیں جس نے گڑیا کی فرمائش کی ہے۔ یہ تمام چیزیں اس کے تھیلے میں موجود ہیں لیکن موبائل اسکا پیچھا چھوڑنے پر تیار نہیں ہے۔

وہ شخص ایک ذیلی اور نیم پختہ سڑک پر مڑ جاتا ہے۔ موبائل کا اسٹیئرنگ بھی اسی جانب گھوم جاتا ہے اور سپاہیوں نے اسے خوفزدہ کرنے کے لیے ہوائی فائرنگ بھی شروع کر دی ہے۔

فائرنگ کی آواز سے ہر طرف بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ دکانوں کے شٹر دھڑا دھڑ گرنے لگتے ہیں لوگ ایک دوسرے پر گرتے ہوئے اندھا دھند بھاگ رہے ہیں لیکن موبائل اور اس شخص کی ریس جاری ہے۔ آخر وہ شخص بدحواس ہو کر ایک دکان میں گھس جاتا ہے اور پچھلے دروازے سے دوسری سڑک پر نکل آتا ہے موبائل بھی دکان میں گھس جاتی ہے۔

''کیا موبائل دکان میں گھس سکتی ہے؟'' مجھ سے کسی نے پوچھا۔

''یہ کون احمق شخص ہے جو مداخلت بے جا کا مرتکب ہوا ہے اور ہماری دانشوری کو چیلنج کر رہا ہے۔ ارے بے وقوف یہ تو موبائل ہے' اس شہر بے یار و مددگار میں تو ٹرک اور بسیں فٹ پاتھوں پر چڑھ جاتی ہیں دکانوں میں در آتی ہیں اور مکانوں تک کو توڑ پھوڑ کر نکل جاتی ہیں۔ تو کس دنیا کی بات کر رہا ہے نامعقول۔''

وہ شخص سہم گیا' پھر بولا۔

''میرا مطلب ہے پولیس موبائل......''

''ارے نادان!'' ہم نے گرج کر کہا۔''یہ ہمارے ملک کی پولیس ہے۔ یہ مکانوں کی کھڑکیوں' دروازے اور چار دیواری توڑ کر اندر داخل ہو جاتی ہے کیونکہ اس کے پاس قانون کا لائسنس ہوتا ہے۔''

''آپ اس نا ہنجار کی بات کو درگزر کریں اور آگے بیان فرمائیں۔'' ایک اور آدمی نے مجمعے کے اندر سے کہا۔

''شاباش!'' ہم نے خوش ہو کر کہا۔''تم سمجھ دار آدمی معلوم ہوتے ہو...... ہاں تو وہ خوفزدہ شخص ایک دکان میں گھس کر پچھلے دروازے سے نکل گیا۔ اس کے تعاقب میں موبائل بھی دکان میں داخل ہوگئی اور عقبی دیوار توڑتی ہوئی سڑک پر نکل آئی۔ وہ شخص پھر بھاگا...... اور موبائل بھی اس کے پیچھے دوڑ پڑی۔ انسان اور مشین کی ریس دوبارہ شروع ہو جاتی ہے۔ اس مرتبہ وہ شخص ایک نہایت ہی تنگ و تاریک گلی میں داخل ہو گیا اور تیزی سے دوڑتا ہوا دوسری جانب مین روڈ پر نکل آیا اس نے ایک لمحہ رک کر ادھر ادھر دیکھا...... اور پھر تیزی سے دائیں جانب بھاگنا شروع کر دیا۔

ابھی وہ چند قدم دوڑا ہوگا کہ موبائل سامنے سے آتی ہوئی نظر آئی۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا اور بدحواس ہو کر الٹے قدموں بھاگنے لگا۔ موبائل بھی اس کے تعاقب میں لگ گئی۔ بعض منچلے نوجوان اس صورت حال سے بے حد لطف اندوز ہو رہے تھے ہر طرف ایک شور تھا' ہنگامہ تھا لوگ دلچسپی سے آنکھ مچولی کا یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ بازیاں لگ رہی تھیں' شرطیں بندھی جا رہی تھیں کہ دیکھئے فتح کس کو نصیب ہوتی ہے۔

قسمت کا مارا وہ شخص جان بچانے کے لیے پھر ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ موبائل بھی اس کے پیچھے گلی میں گھس آئی۔ شخص مذکور نے اور تیز دوڑنا شروع کر دیا لیکن بدنصیبی سے آخری سرے پر گلی بند ہو گئی تھی ایک بلند و بالا دیوار نے فرار کا راستہ مسدود کر دیا تھا البتہ بجلی کا ایک کھمبا وہاں موجود تھا۔ پولیس سے بچنے کے لیے بدحواسی میں وہ شخص بجلی کے کھمبے پر چڑھ گیا اور...... اور......''

''کیا موبائل بھی کھمبے پر چڑھ گئی؟'' مجمعے سے آواز آئی۔

اس آدمی کے سوال نے ہمیں غور و فکر میں مبتلا کر دیا۔ یہ سوال ہماری دانش وری کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہم سوچنے لگے کہ آیا واقعی پولیس موبائل کھمبے پر چڑھ سکتی ہے۔ بظاہر پولیس کی کارکردگی دیکھتے ہوئے تو یہی ہو سکتا ہے کہ موبائل کھمبے پر چڑھ سکتی ہے۔ بلکہ کھجور کے درخت پر بھی چڑھ سکتی ہے۔ ہم نے سوچا ''ہاں'' کہہ دیں لیکن پھر خیال آیا کہ ان جاہلوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی...... یہ سطحی سوچ رکھنے والے اتنی گہرائی میں کہاں جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے کہا۔

''موبائل کھمبے پر چڑھی' بلکہ اس نے کھمبے کو پوری قوت سے ٹکر ماری کھمبا نیچے گر گیا...... اس کے ساتھ ہی وہ شخص بھی گرا...... اور اس پر بجلی کے تار گرے کچھ چنگاریاں نکلی کچھ پٹاخے چھوٹے اور وہ شخص

پولیس کی دسترس سے بہت دور چلا گیا...... بہت دور......"

......☆......

اگلے روز سنسنی پھیلانے والے اخبارات نے صفحہ اول پر خبر لگائی۔

پولیس مقابلے میں ایک خطرناک دہشت گرد ہلاک...... خبر کی تفصیل کچھ اس طرح تھی۔

گزشتہ روز ایک خطرناک دہشت گرد فرار ہوتے ہوئے پولیس مقابلے میں ہلاک ہو گیا۔ مصدقہ اطلاع کے مطابق ڈیوٹی پر موجود پولیس موبائل نے ایک مشکوک شخص کا تعاقب کیا۔ اس نے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے کلاشنکوف سے پولیس پر گولیاں برسائیں۔ پولیس نے نہایت ہوشیاری سے تعاقب جاری رکھتے ہوئے اسے گھیرے میں لے لیا اور سخت مقابلے کے بعد بالآخر پولیس کی گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ دشمن ملک کا تربیت یافتہ دہشت گرد تھا۔ اس کے قبضے سے ایک تھیلا برآمد ہوا ہے جس میں دو عدد ہینڈ گرنیڈ ایک غیر ملکی ساختہ ریوالور اور ڈیڑھ سو کے قریب راؤنڈ برآمد ہوئے ہیں۔ اس کی خفیہ جیبوں سے اہم نوعیت کی دستاویزات اور کچھ تصاویر بھی برآمد ہوئی ہیں۔ باور کیا جاتا ہے کہ وہ اہم تنصیبات کو تباہ کرنے اور ملک میں افراتفری پھیلانے کی غرض سے بھیجا گیا تھا۔ ایک کاغذ پر کچھ لوگوں کے نام بھی لکھے ہوئے ملے ہیں جو دہشت گرد کے ساتھی خیال کیے جاتے ہیں۔ پولیس سرگرمی سے ان کو تلاش کر رہی ہے۔ سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔ مزید برآں اعلیٰ حکام نے پولیس پارٹی کو نقد انعامات اور تعریفی اسناد دینے کی سفارش کی ہے۔

......☆......

دوسری جانب ایک نوجوان عورت اپنے نیم پختہ مکان میں بے چینی سے ٹہل رہی ہے۔ وہ کبھی اپنی ننگی کلائیوں کو دیکھتی ہے جن کے لیے اس کے شوہر نے چوڑیاں لانے کا وعدہ کیا ہے اور کبھی منتظر نظروں سے دروازے کی طرف تکنے لگتی ہے۔ اس کے لبوں پر خیر کے کلمات ہیں۔ وہ بار بار دروازے پر جا کر گلی کے آخری سرے تک دیکھ آتی ہے۔ اس کے چہرے سے فکر و پریشانی ہویدا ہے۔ اس نے قرض ادھار کر کے بڑے چاؤ سے شوہر کا من پسند کھانا پکایا ہے۔ کیونکہ آج وہ تنخواہ لے کر آنے والا ہے...... مگر کافی رات گزر گئی ہے اور وہ ابھی تک نہیں آیا ہے۔ اس کی بچی بار بار ماں کے گلے میں اپنی ننھی ننھی بانہیں ڈال کر کہتی ہے۔

"امی! ابو ابھی تک نہیں آئے...... میری گڑیا نہیں لائے۔"

دوسری طرف بانس کی چرچراتی ہوئی چارپائی سے شوہر کی بیمار ماں لرزاں آواز میں پوچھ رہی ہے۔

"بہو! بیٹا آیا...... دوا لایا......؟"

نئے افق اگست ۱۹۹۳ء

ابن صفی سے باتیں

شکیل صدیقی

شکیل صدیقی:۔ صفی صاحب آپ نے جاسوسی ناول لکھنے کا آغاز کب کیا اور جاسوسی چیزیں لکھنے کی تحریک آپ کو کیوں کر ہوئی؟

ابن صفی:۔ یہ ۱۹۵۲ء میں الہ آباد کا واقعہ ہے ایک جگہ کتابوں کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ ایک بزرگوار بولے اردو میں صرف جنسی اور فحش کتابیں ہی زیادہ بک سکتی ہیں۔ میں نے کہا قطعی غلط ہے ابھی کئی ایسے مضوعات ہیں جنہیں ہاتھ نہیں لگایا گیا اور وہ اپنے لیے اچھی خاصی مارکیٹ بنا سکتے ہیں۔ لوگوں نے زبردست مخالفت کی کہ یہ ممکن نہیں۔ میں نے کہا اچھی بات ہے میں کوشش کروں گا۔ شاید بات آپ کی سمجھ میں آ جائے۔ اس بحث کے بعد کچھ روز گزار کر میں نے الہ آباد سے ایک رسالہ ''جاسوسی دنیا'' کے نام سے جاری کیا جس میں ہر ماہ ایک جاسوسی ناول پیش کیا جاتا تھا لیکن بیماری سے اٹھنے کے بعد میں پابندی وقت کو برقرار نہیں رکھ سکا۔

شکیل صدیقی:۔ وہ بات تو رہ ہی گئی کہ آپ کو جاسوسی ناول لکھنے کی تحریک کیسے ہوئی یا آپ اس طرف رجوع کیسے ہوئے؟

ابن صفی:۔ بچپن میں قیسی رام پوری کا ایک ناول پڑھا تھا۔ اس کا نام تھا ''طلسمی فوارہ'' یہ پہلا ناول تھا جو میں نے پڑھا۔ اس وقت میری عمر دس گیارہ سال کی ہو گی اسی سے مجھے چاٹ لگی۔

شکیل صدیقی:۔ آپ کے خیال میں اردو میں سب سے پہلا جاسوسی ناول کب لکھا گیا اور کیا وہ کسی سے متاثر تھا؟

ابن صفی:۔ میرے خیال میں قیسی رام پوری کا ناول طلسمی فوارہ ہی تھا جو انہوں نے بعد میں ''رانی'' کے نام سے چھاپا۔ اگر چہ وہ ناول خالص جاسوسی نہیں لیکن اس میں جاسوسیت کے جراثیم پائے جاتے ہیں اور یہ غالباً اوریجنل ہے کسی سے متاثر نہیں۔ اردو میں سب سے بڑی چیز جس سے کسی نے کچھ سیکھا ہی نہیں اور جس سے لوگ بہت کچھ سیکھ سکتے تھے۔ وہ ''طلسم ہوشربا'' ہے اس میں عمرو عیار کی عیاریوں سے بہترین قسم کے جاسوسی ناولوں کا لطف آتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ میرے تخیل کو زرخیزی طلسم ہوشربا ہی سے نصیب ہوئی میں نے طلسم ہوشربا کے سارے دفاتر چاٹ ڈالے ہیں۔ میں اپنے ناولوں میں یقینی طور پر طلسم ہوشربا ہی سے متاثر ہوں...... انگریزی میں لکھنے والوں کا لوہا ضرور مانتا ہوں مگر ان سے متاثر نہیں ہوں۔

شکیل صدیقی:۔ اچھا یہ بتائیے کہ جاسوسی ناول لکھتے وقت آپ کے پیش نظر کیا مقصد ہوتا ہے؟
ابن صفی:۔ جاسوسی ناول لکھنے سے مقصد صرف تفریح۔
شکیل صدیقی:۔ کیا آپ معاشرے کا اخلاقی پہلو بھی مدنظر رکھتے ہیں اور کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کا طرز تفریح ذہنوں پر کیا اثرات مرتب کرتا ہے؟
ابن صفی:۔ اخلاقی پہلو کو فیشن کے طور پر پیش نظر رکھتا ہوں۔ جاسوسی ناول لکھنے سے میرا مقصد اصلاح کبھی نہیں ہوتا۔ اصلاح میرے نزدیک ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ اصلاح کے لیے میں نے جاسوسی ناول کبھی نہیں لکھے۔
شکیل صدیقی:۔ لیکن اس کے باوجود بھی آپ کی کتابوں میں عورت اور مرد اس قدر دور دور رہتے ہیں؟
ابن صفی:۔ بات در اصل یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ ارتقا کی اس منزل میں ہے جہاں عورت اور مرد کے درمیان کم از کم ایک چپل کا فاصلہ تو ضرور ہونا چاہیے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اگر مردوں کے دوش بدوش ترقی کی راہ پر چلنے والی کوئی عورت کسی فٹ پاتھ پر چلتی جا رہی ہے اور آپ سے سہواً بھی ٹکراؤ ہو گیا تو آپ اسے دوش بدوش کے بجائے پاپوش بدست دیکھیں گے۔
شکیل صدیقی:۔ کیا وجہ ہے کہ آپ کے ناولوں میں عشق اور جنسی Touches بہت کم ہوتے ہیں؟
ابن صفی:۔ یہ سب میرے بس کا روگ نہیں نہ میں افلاطونی عشق کا قائل ہوں اور نہ جنسی بے راہ روی کا۔ لہٰذا آپ کو میرے ناولوں میں نہ تو لیلیٰ مجنوں کی کہانیاں مل سکتی ہیں اور نہ کسی ڈان ژون کی داستان ویسے میں نے جاسوسی ناول لکھنا ہی اس لیے شروع کیے کہ کسی طرح جنسی لٹریچر کا سیلاب رک سکے۔
شکیل صدیقی:۔ لیکن اس کے باوجود بھی آپ کا ایک ناول ''ڈیڑھ متوالے'' کسی حد تک مائل بہ عریانی ہو گیا۔
ابن صفی:۔ محض خیال ہے آپ کا۔ ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ ویسے جنسیت سے دامن بچانا ناممکن ہے۔ کوئی بھی اس سے کترا کر نکل ہی نہیں سکتا۔ البتہ کچھ مادر پدر آزاد ہو جاتے ہیں اور کچھ کسی قدر ''ملفوف'' ہو کر اس کے قریب سے گزر جاتے ہیں۔ مثلاً مرزا غالب فرماتے ہیں۔

نینداس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
جس کے شانوں پہ تری زلفیں پریشان ہو گئیں

کیا فرمایا ہے انکل غالب نے؟ غالباً آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ کسی قسم کی عبادت کے دوران میں کسی کی زلفیں کسی کے شانوں پر پریشان نہیں ہوتیں۔ بس تو پھر ڈیڑھ متوالے میں پائے جانے والے جنسی Touches بھی اسی قبیل کی چیز ہیں۔ آپ انہیں......فحاشی نہیں کہہ سکتے۔ ویسے موضوع کی مناسبت

سے کبھی کبھی اسپ خانہ کی باگیں ڈھیلی چھوڑنی ہی پڑتی ہیں۔ رہی جنسی تلذذ کی بات تو وہ یار لوگ اکثر مذہبی کتب سے بھی حاصل کر لیتے ہیں ۔خود مجھ سے ایک بار ایک صاحب نے دانت پر دانت جما کر بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا تھا کہ صفی صاحب! آپ نے بہشتی زیور میں غسل کا بیان کبھی پڑھا ہے؟

شکیل صدیقی:۔ کچھ لوگ اس بات کے شاکی ہیں کہ آپ کے ناولوں میں ایکشن کا قحط ہوتا جا رہا ہے حالانکہ اس کے لیے آپ کو تو ہاتھ پیر ہلانے نہیں پڑتے۔

ابن صفی:۔ وہ تو ٹھیک ہے مگر اصل میں انگریزی کی...... اسپائی اسٹوریز پر مبنی فلموں نے بعض پڑھنے والوں کا ٹیسٹ بگاڑ دیا ہے اور وہ مجھ سے بھی یہی چاہتے ہیں کہ میرا ہیرو بھی ہر حال میں فولاد کا پٹھا ثابت ہو۔ اوپر ہوائی جہاز' نیچے توپیں' دائیں' سمندر' بائیں آتش فشاں' بھی وہ بموں سے بچتا ہے' کبھی توپوں کے گولوں سے۔ توپیں چلیں اور وہ دھم سے گر پڑا۔ ارض و سما سمجھے قصہ پاک ہوا لیکن یہ کیا؟ اس نے ایک توپ کے دہانے سے چھلانگ لگائی تھی اور اس کی دم کی طرف سے نکل کر سمندر کی ایک کشتی میں جا بیٹھا۔ توپیں منہ دیکھتی رہ گئیں۔ ہوائی جہازوں نے منہ کی کھائی۔ آتش فشاں منہ پیٹنے لگا اور قاری کا منہ دیکھنے کے قابل لیکن ہیرو دوبارہ منہ دکھاتا ہے۔ میں باز آیا خدا مجھے معاف کرے۔

شکیل صدیقی:۔ بعض ادیبوں کا خیال ہے کہ جاسوسی ناولوں کی وجہ سے جرائم پھیلتے ہیں؟

ابن صفی:۔ سب سے پہلا جرم ہابیل قابیل والی ٹریجدی ہے اور میں آج خدا کو حاضر و ناظر جان کر آپ کو اطلاع دے رہا ہوں کہ اس ٹریجڈی سے پہلے میں نے کوئی جاسوسی ناول نہیں لکھا تھا۔ لیکن کوا بیچارہ آج تک پشیمان ہے کہ اس نے حضرت آدم کو مٹی کھود کر دفن کر دینے کا فن کیوں سکھایا۔ کوے کا خیال ہے اس کی اس غلطی کی بنا پر آج اولادِ آدم آدمی ہی کو زندہ دفن کر دینے کے فن میں طاق ہو گئی ہے۔

شکیل صدیقی:۔ ادب میں آپ کا کیا مقام ہے؟ آپ ادب کی خدمت کیوں نہیں کرتے؟

ابن صفی:۔ آپ تو مجھے صرف اردو کی خدمت کرنے دیجیے۔ اس کے باوجود کہ صرف و نحو کی غلطیاں مجھ سے بھی سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ آپ اس وقت کی خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے جب مجھے کسی سندھی یا بنگالی کا خط بہ ایں مضمون ملتا ہے کہ محض آپ کی کتابیں پڑھنے کے شوق میں اردو پڑھ رہا ہوں۔ پڑھ کر سنانے والوں کا احسان کہاں تک لیا جائے۔

اب بتایئے ادب کی خدمت کروں یا میرے لیے اردو کی خدمت مناسب ہو گی۔ ویسے اپنے نظریات کے مطابق میں ادب کی بھی خدمت کر رہا ہوں اور سوسائٹی کی بھی...... میری اس خدمت کا انداز نہ تو بدلتے ہوئے حالات سے متاثر ہوتا ہے اور نہ وقتی مصلحتوں کے تحت کوئی دوسری شکل اختیار کر سکتا ہے۔ بہر حال میں قانون کا احترام سکھاتا ہوں۔

پھر کچھ لوگ ادب میں میرے مقام کی بات شروع کر دیتے ہیں اس سلسلے میں عرض ہے کہ آپ کی نظروں میں میرا کوئی مقام تو ضرور ہے۔ ورنہ آپ کو اس کی فکر ہرگز نہ ہوتی۔

اساطیری کہانیوں سے لے کر مجھ حقیر کی کہانیوں تک آپ کو ایک بھی ایسی کہانی نہ ملے گی جس میں جرائم نہ ہوں اور آج بھی آپ جسے بہت اونچے قسم کے ادب کا درجہ دیتے ہیں اور جس کا ترجمہ دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ کیا جرائم کے تذکروں سے پاک ہوتا ہے؟ کیا اس کے ضرررساں پہلوؤں پر ہمارے نقاد کی نظر نہیں پڑتی؟ اگر نہیں تو کیوں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے لوگ کہانیوں میں بھی (جو دراصل ذہنی فرار کا ذریعہ ہوتی ہیں) پولیس یا جاسوس کا وجود برداشت نہیں کر سکتے چلیے پولیس کو اس لیے برداشت کر لیں گے کہ وہ للکار کر سامنے آتی ہے لیکن جاسوس تو بے خبری میں پتہ نہیں کب گردن دبوچ لے۔

لہٰذا اگر مجھے ادب میں کوئی مقام پانے کی خواہش ہے تو جاسوس کو چھٹی دینی پڑے گی لیکن میں اس پر تیار نہیں ہوں کیونکہ مجھے ہر حال میں "شر" پر "خیر" کی فتح کا پرچم لہرانا ہے۔ میں باطل کو حق کے سامنے سربلند نہیں دکھانا چاہتا ہوں۔ میں معاشرے میں مایوسی نہیں پھیلانا چاہتا' ایسی مایوسی جو غلط راہوں پر لے چلے۔

شکیل صدیقی:۔ چلیے آپ ادیب نہ سہی لیکن مشاہیر کے ساتھ تو آپ کا نام لیا جا سکتا ہے؟

ابن صفی:۔ میں آپ سے متفق نہ ہوتا لیکن ابھی حال ہی میں کراچی کا ایک ماہنامہ نظروں سے گزرا جس میں معلومات عامہ سے متعلق ایک سوالنامہ شائع ہوا ہے اس کا پانچواں سوال اس طرح ہے۔

(۵) کیا آپ کو ان مشہور شخصیتوں کے اصل نام یاد ہیں؟ (الف) داتا گنج بخش (ب) حافظ شیرازی (ج) مولانا ابوالکلام آزاد (د) فردوسی (س) شیر شاہ سوری (ط) شوکت تھانوی (ن) بھولو پہلوان (گ) ابن صفی...... ملاحظہ فرمائی آپ نے مرتب کی کوشش ہے مجھ میں اتنی ہمت کہ بھولو پہلوان صاحب کو ہٹا کر شوکت تھانوی کے برابر کھڑا ہو سکوں؟

شکیل صدیقی:۔ اچھا آپ کے نزدیک اسلامی سوشلزم اور خالص سوشلزم میں کیا فرق ہے؟

ابن صفی:۔ یہ باتیں تو آپ کو کسی سیاست دان سے پوچھنا چاہیے تھیں میں تو ایک عام آدمی کی حیثیت سے اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اب اس سوشلزم کے تحت چار شادیاں کی جا سکیں گی (خالص سوشلزم اس کی اجازت نہیں دے سکتا) اور خاندانی منصوبہ بندی کی صورت یہ ہوگی۔

پہلی بیوی۔ لیڈی ڈاکٹر۔ دوسری بیوی لیکچرار۔ تیسری بیوی سوشل ورکر۔ چوتھی بیوی مڈوائف۔

اور اگر سوشل ورکر بیوی اتفاق سے وزیر بن گئی تو پھر شوہر کی اقتصادی حالت کا کیا پوچھنا۔ ہاں

تو میری دانست میں عورت ہی سب سے بڑی دولت ہے۔ اور اس کی تقسیم ایسی ہی منصفانہ ہونی چاہیے۔

شکیل صدیقی:۔ آپ کس ازم کے قائل ہیں؟

ابن صفی:۔ قریب قریب سارے ہی موڈرن ازم میرے مطالعے میں آ چکے ہیں لیکن میں قائل کسی کا بھی نہیں میں تو اللہ کی ڈکٹیٹرشپ کا قائل ہوں۔ اس میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی کہ جب جتنے پیگ کا نشہ ہوا ویسا ہی بیان داغ دیا۔ آپ بھی کسی ازم وزم کے بجائے اسلام کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ اسلام کے علاوہ سارے ازم محض وقتی حالات کی پیداوار ہیں۔ اور کسی ایک ازم کی کوئی دشواری کسی زمانے میں دوسرے ازم کی پیدائش کا باعث بنتی ہے۔ اسلامی نظام آج بھی قابل عمل ہے۔

شکیل صدیقی:۔ لیکن دیکھیے نا اب دوبارہ نہ تو ڈاڑھیاں رکھی جا سکتی ہیں نہ بیل باٹم چھوڑا جا سکتا ہے پھر وہ خواتین جو اپنا پردہ مردوں کے عقل پر ڈال چکی ہیں دوبارہ اس کو کیسے اپنائیں گی؟

ابن صفی:۔ صاحب! کیا رکھا ہے ان باتوں میں آپ کا ظاہر کچھ بھی ہو لیکن دل مسلمان ہونا چاہیے کچھ نیکیاں سچے دل سے اپنا کر دیکھیے آہستہ آہستہ آپ خود کسی جبر وکراہ کے بغیر اپنا ظاہر بھی اللہ کے احکامات کے مطابق بنالیں گے۔

بس جیسے ہی آپ انفرادی طور پر اللہ کے احکامات کے آگے جھکے یہ سمجھ لیجیے کہ ایک ایسا یونٹ بن گیا جس پر اللہ کی ڈکٹیٹرشپ قائم ہے۔ انفرادی طور پر اپنی حالت سدھارتے چلے جایئے پھر دیکھیے کتنی جلدی ایک ایسا معاشرہ بن جاتا ہے جس پر اللہ کی حاکمیت ہو۔ قرآن کو پڑھیے اس پر عمل کیجیے' اسے علم الکلام کا اکھاڑہ نہ بنایے۔

شکیل صدیقی:۔ شروع میں آپ نے کہا ہے کہ آپ طلسم ہوشربا سے بہت متاثر ہیں اور غالباً اسی کا اثر ہے کہ بندروں کے بن مانس بنائے۔

ابن صفی:۔ کیا کیا جائے صاحب! لوگوں کو اس میں لطف آتا ہے کہ ایک مرغی نے انڈا دیا' انڈا زمین پر گرتے ہی شق ہوا اور اس میں سے ایک بچہ نکل آیا۔ اس بچے نے آن واحد میں جوان ہو کر ککڑوں کوں اسٹارٹ کر دیا۔ بات کیا تھی؟ مرغی نے تفریحاً ایک ایٹم اگل دیا تھا۔ یہ اسی کی چڑیا ایسی ہاتھ لگی ہے کہ اس نے طلسم ہوشربا کے نارنج وترنج کے منہ بھی پھیر دیے ہیں۔ اگر صحیح معنوں میں کوئی سائنس فکشن پیش کیا جائے تو لوگ بور ہو کر کتاب اپنے سر پر مار لیں گے۔ میرا دعوا ہے ویسے تو میں نے بندروں سے بن مانس بنائے ہیں اور لوگوں نے خوب تالیاں بھی پیٹی ہیں لیکن موت کی چٹان میں' میں نے جہاں جہاں اس کے امکانات پر بحث کی ہے اگر وہ مختصر نہ ہوتی تو آپ کو ہائی بلڈ پریشر ہو جاتا۔

شکیل صدیقی:۔ لیکن پھر بھی آپ کا ناول دیو پیکر درندہ ہوشربا کا ایک باب معلوم ہوتا ہے۔

ابن صفی:۔ جاسوسی دنیا کا آئرن جوبلی نمبر دیوپیکر درندہ ذہنوں کی تبدیلی کے امکانات پر لکھا گیا ہے بعض پڑھنے والوں کو یہ چیز طلسم ہوشربا معلوم ہوئی۔
بات دراصل یہ ہے کہ کہانیاں لکھنے والے کسی موضوع پر اتھارٹی نہیں ہوا کرتے ان کا کام محض امکانات کا جائزہ لینا ہے آج جبکہ ایک مردہ آدمی کی آنکھیں کسی نابینا کو روشنی بخش سکتی ہیں تو اسے بھی ناممکن نہ سمجھنا چاہیے کہ ایک ذہن اپنے تمام تر تجربات سمیت کسی دوسرے جسم میں منتقل کیا جا سکے۔
سات آٹھ سال پہلے کی بات ہے میں نے ''طوفان کا اغوا'' میں فولادی پیش کیا تھا۔ کچھ عرصہ ہوا روس سے یہ خبر آئی تھی کہ وہاں فولادی تخلیق کر لیا گیا۔ وہ نہ صرف ٹریفک کنٹرول کرتا ہے بلکہ خلاف ورزیوں پر چالان بھی کر دیتا ہے۔ اور اس کو کنٹرول کرنے کا طریقہ بھی وہی ہے جو میں نے لکھا تھا۔
حاشا وکلا میں روس والوں پر چوری کا الزام نہیں عاید کرنا چاہتا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی خیال بیک وقت ایک سائنٹسٹ اور کہانی کار کے ذہن میں جنم لے سکتا ہے۔ کہانی کار قلمی تصویر بناتا ہے اور سائنٹسٹ اسے جیتی جاگتی دنیا میں مادی شکل دے دیتا ہے۔
شکیل صدیقی:۔ آپ نے سائنس فکشن بھی لکھے اور لوگوں کی داد بھی وصول کی لیکن ابھی تک آپ نے چاند فکشن نہیں لکھا؟ فریدی' حمید کو چاند پر کب بھیجیں گے؟
ابن صفی:۔ اگر میں نے فریدی حمیدی کو چاند پر بھیج دیا تو خود کیا زمین پر رہ کر خاک پھانکوں گا یا پھر ٹھہریے' ذرا انہیں دیکھ لیجیے جو چاند میں پہنچنے کے منصوبے بنا رہے ہیں جب ان کی خیریت کا تار آ جائے گا تو ان دونوں کی خیریت خداوند کریم سے نیک چاہوں گا۔ انہیں بھی چاند پر روانہ کر دوں گا۔ ویسے فی الحال اگر جی چاہے تو چندا ماما تا تا والا گیت سن لیجیے کیونکہ ابھی تک وہ بچہ جسے آدمی کا باپ کہتے ہیں چاند کے معاملے میں اس گیت سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ پھر آپ خود سوچیے اگر وہاں حمید کو مرغیوں کے سے چہرے اور گلہریوں کی سی دمیں رکھنے والی لڑکیاں نظر آئیں تو اس غریب کا کیا حال ہوگا۔ کیا اس کی خودکشی آپ کے لیے افسوسناک نہ ہوگی۔ ویسے تو وہ زمین پر ہی سوچتا ہے کہ زندگی چاندنی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں۔
شکیل صدیقی:۔ ایک شکایت صفی صاحب' لوگوں کو آپ سے یہ بھی ہے کہ آپ کے ناولوں میں کتابت کی غلطیاں بہت ہوتی ہیں' کبھی آپ بالصواب کو بالثواب لکھتے ہیں کبھی حمید کے حلق سے دو چار پائیاں اتار دیتے ہیں۔ آخر اس کی وجہ؟
ابن صفی:۔ عرض ہے کہ عطف اضافت کی غلطیاں اکثر بغور دیکھنے کے باوجود بھی رہ جاتی ہیں۔ ویسے پوری کوشش کی جاتی ہے کہ ایسا نہ ہونے پائے پھر جناب کاتب حضرات تو ہاتھ سے لکھتے ہیں۔ اور یہ اچھا

ہی ہے کہ دماغ استعمال نہیں کرتے۔ اگر کبھی دماغ بھی استعمال کر جاتے ہیں تو پھر مصنف کے لیے ملک الموت ہی ثابت ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ ہے کسی اچھے لکھنے والے نے شہرہ آفاق مصور پکاسو پر ایک مضمون لکھا اور مضمون کی سرخی بھی پکاسو ہی رکھی۔ کاتب صاحب لکھتے وقت چونکے 'سرخی کو آنکھیں پھاڑ کر گھورا پھر مسکرائے اور سر ہلا کر زیر لب بولے۔ ''اچھا' لکھنا بھول گئے۔'' لہٰذا انہوں نے ازراہ چشم پوشی ایڈیٹر سے بھی کچھ نہ کہا اور سرخی جما دی ''پکاسور'' پھر پورے مضمون میں جہاں بھی پکاسو کا نام آیا۔ ''ر'' کا اضافہ کرتے چلے گئے۔ لہٰذا رسالے میں پکاسور پر ایک مبسوط مقالہ شائع ہو گیا اور ایڈیٹر صاحب اپنی میز پر سر کے بل کھڑے سوچتے رہ گئے کہ آئندہ پڑھے لکھے لوگوں کو کیسے منہ دکھائیں گے۔

شکیل صدیقی:۔ صفی صاحب آپ کے ناولوں کا ایک اچھا قاری ہونے کے ناتے سے میں نے ایک بات نوٹ کی ہے کہ آپ کے جاسوسی دنیا والے سلسلے میں ایک جھول پیدا ہو گیا ہے جس کی طرف شاید آپ کا بھی خیال نہیں گیا۔

ابن صفی:۔ واقعی بہت خوب' ذرا اس جھول کا انکشاف بھی فرما دیں۔

شکیل صدیقی:۔ آپ نے کئی جگہ لکھا ہے کہ فریدی نے جو سانپ پال رکھے ہیں انہیں اپنے ہاتھ سے دودھ پلاتا ہے لیکن آپ نے ہی کئی جگہ لکھا ہے کہ وہ کئی کئی ماہ گھر سے باہر رہ کر اپنے فرائض انجام دیتا ہے تو پھر اس کی غیر حاضری میں انہیں کون دودھ پلاتا ہے؟

ابن صفی:۔ سمجھ میں نہیں آتا اس کا کیا جواب دیا جائے بہر حال ہو سکتا ہے کہ اس نے اس کے لیے چند نرسیں رکھ چھوڑی ہوں ویسے میرا خیال ہے کہ فریدی کے سانپ بھی اتنے تربیت یافتہ اور مہذب تو ہوں گے ہی کہ اس کی عدم موجودگی میں کسی دوسرے کے ہاتھ سے ملی ہوئی خوراک پر ناک بھوں نہ چڑھائیں بہر حال وہ اس کا بھی کچھ نہ کچھ انتظام رکھتا ہوگا۔ مصنف کے بس کا روگ نہیں ہے کہ ہر وقت فریدی صاحب کے پیچھے لگا رہے۔

شکیل صدیقی:۔ بجا ارشاد فرمایا آپ نے جبھی تو ایک دفعہ حمید بھی طوائفوں کے کوٹھے پر پہنچ گیا تھا۔ آپ کو گیتوں کے دھماکے والا واقعہ یاد ہے؟

ابن صفی:۔ جی ہاں یاد ہے' لیکن غالباً آپ نے حمید کی سرگزشت ''ٹھنڈی آگ'' نہیں پڑھی۔ وہ کچھ ایسا ہی آوارہ منش تھا آدمی تو اس کو فریدی نے بنایا ہے۔ ویسے مطمئن رہیے اب برخوردار حمید سلمہ' ایسی حرکتیں نہیں کرے گا۔ میں اب نہ صرف اس کو منع کر دوں گا بلکہ ہو سکتا ہے دو چار ہاتھ بھی جھاڑ دوں۔

شکیل صدیقی:۔ صفی صاحب اس ڈائجسٹی دور میں آپ اتنے مقبول ہو گئے ہیں کہ آپ پر الف لیلہ

ڈائجسٹ ایک نمبر بھی نکال رہا ہے کوئی آپ کو مغنی ناز کہہ رہا ہے' کوئی آپ کو ایشیا کا سب سے بڑا جاسوسی ناول نگار قرار دے رہا ہے یعنی ایک طرح سے آپ پبلک پراپرٹی بنتے جارہے ہیں۔ تو یہ چیز آپ کے لیے کس پریشانی کا باعث تو نہیں ہے؟

ابن صفی:۔ اپنے تئیں تو ٹھیک ہے کوئی کچھ بھی کہتا رہے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن بہتر ے حضرت میری ذاتیات سے متعلق بھی بے تکے قسم کے سوالات کرتے ہیں میں کہتا ہوں کہ آخر اس سے پڑھنے والوں کو کیا سروکار کہ مجھے کریلے پسند ہیں یا نہیں یا صرف نیم چڑھے کریلے پسند آتے ہیں۔ میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھوٗ کی عادت میں تو مبتلا نہیں؟ میرے کتنے بچے ہیں؟ دوسری شادی کی ضرورت پیش آئی تو پہلی بیوی تحریری اجازت نامہ دینے سے انکار تو نہیں کریں گی؟ اگر کرے تو کیا کریں گے؟ کونسی پیتے ہیں؟ نہیں پیتے تو کیوں نہیں پیتے' وجہ لکھیے کتابوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ عشق ومحبت کے قائل نہیں؟ آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا کبھی کوئی گہری چوٹ کھائی تھی؟

ایک صاحب نے تو یہاں تک مشورہ دیا کہ ریوالور لٹکا کر نکلا کیجیے اس طرح کم از کم آپ جاسوسی ادیب تو معلوم ہوسکیں گے۔

ہے آپ کے پاس اس کا کوئی جواب؟

قارئین کرام! اس انٹرویو کے اختتام پر ایک بڑا اعتراض مجھ پر بھی ہوگا کہ جب صفی صاحب نے یہ انٹرویو قلمبند نہیں کروایا تو میں نے اس کو کہاں سے حاصل کیا۔ اس کے جواب میں میں یہ عرض کروں گا کہ میں نے ان کے ناولوں کے دلچسپ ''پیشرس'' سامنے رکھ کر یہ انٹرویو مرتب کیا ہے۔

شکیل صدیقی

(نیا رخ اگست 1981)

نیا رخ
کراچی

نومبر ۱۹۸۰ء

بانی ——— ابن صفی
مدیر ——— مشتاق احمد قریشی
مدیر مسئول ——— فضل الحق قریشی
——— وسیم غزالی
نائب مدیر ——— ابرار صفی
——— کلیم
——— طاہر احمد
——— سلیم

نیارخ کا پہلا شمارہ حاضر خدمت ہے

مشتاق احمد قریشی

''جاسوسی دنیا'' اور ''عمران سیریز'' کے بعد ''ابن صفی میگزین'' یعنی نئے افق...... اور پھر ''آنچل'' یہ محترم ابن صفی کا ایک طویل ادبی سفر ہے' ان کے تمام ناول اور رسالے اس ادبی سفر کے سنگ میل ہیں۔ کامیابی کے بے شمار جھنڈے گاڑنے والے ایشیا کے نامور مصنف ابن صفی کی بے چین طبیعت کو پھر بھی قرار نہ آیا۔ ایک نئے خیال اور ایک نئے عزم نے انہیں بے چین کر دیا اور یہ عزم عملی شکل اختیار کر کے ''نیارخ'' بن گیا۔ ان کی شبانہ روز محنت سے اس کے ابتدائی چھ شمارے ترتیب پائے' اسی اثنا میں ابن صفی کی صحت خراب ہوگئی اور وہ اسپتال میں داخل ہو گئے۔ ڈاکٹروں نے مکمل آرام کا مشورہ دیا۔ گھر منتقل ہونے کے باوجود' ان کا ایک لمحہ بھی آرام میں نہ گزرا۔ شب و روز کام کرتے رہے اور ''شال کا فتنہ'' مکمل کرنے کے چند ہی روز بعد ''آسمان ادب کا یہ آفتاب' کائنات کی وسعتوں میں گم ہو گیا مگر رہتی دنیا تک اپنا نام چھوڑ گیا۔ دلوں پر جو نقش چھوڑ گیا وہ تا ابد قائم رہیں گے۔ نئے افق کا اجرا ہوا تھا تو وہ ہم میں موجود تھے۔ آنچل لہرایا تھا تو ان کے ہونٹوں پر آسودہ مسکراہٹ ہم نے دیکھی تھی مگر ''نیارخ'' کا پہلا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے...... اور ابن صفی اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھنے کے لیے ہم میں موجود نہیں ہیں۔ کیا یہ بے رخی صرف ''نیارخ'' ہی کے مقدر میں تھی؟ یا پھر انہیں ہم پر اتنا اعتماد تھا کہ انہوں نے اپنی محنتوں کا نتیجہ دیکھنے کا انتظار بھی کرنا گوارا نہ کیا اور آنکھیں بند کر لیں؟ ''نیارخ'' کے اس شمارے میں ہر پڑھنے والے کی دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ اس کی ترتیب اور مزاج خود ابن صفی نے بنایا ہے۔ اس لیے ہمیں امید ہے کہ آپ کی پسند اور معیار پر پورا اترے گا۔ ابن صفی نے آپ کو کبھی مایوس نہیں کیا' وہ آپ کے مزاج اور آپ کی خواہشوں کو سمجھتے تھے بلکہ اگر انہیں قارئین کا سب سے بڑا نباض کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ آج ہمارے ملک میں جتنے بھی رسائل شائع ہو رہے ہیں' ان کو پڑھنے والوں کا حلقہ' ابن صفی ہی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اس بات سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے؟ ابن صفی' آپ ہی کے مشوروں کو نشان راہ سمجھا کرتے تھے اور انہی کو سامنے رکھ کر نت نئے اقدامات کرنا ان کی عادت تھی...... ہم بھی اسی راہ پر' ان کے نقش قدم دیکھتے ہوئے چل رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں' آپ کے مشوروں کا انتظار رہے گا۔ ان مشوروں کی روشنی میں کام کرنے کے بعد ہم آپ کو کبھی مایوس نہیں کریں گے۔''

شمارہ ۱۰
اگست ۔۔۔ ۱۹۸۱
قیمت ۱۲/۰ روپے

نیا رخ کے پہلے شمارے کا اداریہ

مشتاق احمد قریشی

جوں جوں ۲۶ جولائی قریب آ رہی ہے' میرا دل لرز رہا ہے...... اور یہ سب کچھ لکھتے ہوئے میرا قلم بھی کانپ رہا ہے۔ ابھی کل ہی کی بات معلوم ہوتی ہے کہ میں ۲۵ جولائی ۱۹۸۰ کو دفتر سے واپسی پر شام ۵ بجے محترم ابن صفی سے ملا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک معلوم ہوتے تھے دیکھ کر حسب معمول تبسم فرمایا اور پوچھا ''کیوں بھئی پرچہ تقسیم ہوگیا؟'' میں نے جواب دیا۔ ''آج تو نہیں' ہاں انشاء اللہ کل ضرور ہو جائے گا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے نئے افق کا شمارہ اگست کی ایک کاپی بریف کیس سے نکال کر پیش کی۔ پرچہ دیکھ کر مسکرائے اور گویا ہوئے۔ ''یار تم نے تو یہ ۲۵ تاریخ اپنے سر پر سوار کرلی ہے'' وہ پرچہ دیکھتے ہوئے اوران کی مسکراہٹ گہری ہوتی رہی' حتیٰ کہ انہوں نے پرچے کو تکیے کے نیچے سرکاتے ہوئے کہا۔ تفصیل سے رات کو دیکھوں گا۔ تم سناؤ' کام کیسا چل رہا ہے؟ میں نے انہیں تمام امور سے مطمئن کیا اور جانے کی اجازت چاہی کیونکہ میں نے محسوس کرلیا تھا کہ بات چیت سے وہ کچھ نقاہت محسوس کر رہے ہیں۔ انہوں نے خلاف معمول میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''کل آؤ گے نا؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''کسی دن ناغہ کرتا ہوں کیا؟'' نہ جانے کیوں اداس اداس سے نظر آنے لگے۔ کبھی کبھی میں بہت پریشان ہو جاتا ہوں۔ تم سے باتیں کرکے جی ہلکا ہو جاتا ہے۔ اچھا جاؤ' خدا حافظ۔'' میں بھی خدا حافظ کہتا ہوا باہر آ گیا۔ اسی شب کے آخری پہر' سحری سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ناوقت کی اس گھنٹی نے مجھے پریشان کردیا۔ اللہ خیر کرے' میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری جانب سے ابن صفی صاحب کی منجھلی صاحبزادی ثروت اسرار کی رندھی ہوئی آواز سنائی دی۔ پہلے تو کچھ سمجھ میں نہ آیا...... اور جب یہ یقین ہوگیا کہ میں کوئی خوفناک خواب نہیں دیکھ رہا ہوں بلکہ موت' زندگی کو ایک اور چرکا لگانے میں کامیاب ہوگئی ہے تو دل بھر آیا اور آنکھوں کے راستے قطرہ قطرہ بن کر بہنے لگا۔ آج بھی سوچتا ہوں تو ذہن برسوں پیچھے چلا جاتا ہے۔ غالباً ۱۹۵۴ء یا ایک آدھ سال اوپر کی بات ہے کہ میں نے ابن صفی کا ناول دھوئیں کی تحریر پڑھا تو ان کے پہلے تمام ناول پڑھے بغیر چین ہی نہ آیا...... اور تمام ناول پڑھنے کے بعد ابن صفی سے ملاقات کی خواہش بے چین کرنے لگی۔ جون کی ایک تپتی ہوئی دوپہر کو میں سائیکل پر سوار ہو کر نکلا اور لالوکھیت پہنچ کر سی۔ ون ایریا تلاش کرنے لگا۔ خاصا بڑا علاقہ ہے۔ اس لیے مکان ڈھونڈتے ڈھونڈتے گرمی' تکان اور پیاس کی شدت سے نڈھال ہوگیا۔ کپڑے پسینے کی وجہ سے جسم کے ساتھ چپکے جا رہے تھے۔ مکان کے سامنے کھڑا اپنی ہیت کذائی کا جائزہ لیتے ہوئے سوچ میں پڑ گیا کہ اس حلیے

میں اتنے بڑے مصنف کے سامنے جانا چاہیے یا نہیں؟ ابھی اسی گومگو میں تھا کہ ایک صاحب گلی میں داخل ہوئے؟ ان کا منہ پان سے بھرا ہوا تھا۔ ''کیوں میاں! کس کی تلاش ہے؟'' ان صاحب نے دریافت کیا تو بے اختیار میرا سر دائیں بائیں حرکت کرنے لگا۔ ان صاحب نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''بھائی اتنی تیز دھوپ میں کیوں کھڑے ہو۔ سائے میں جا کر کھڑے ہوجاؤ یا چلو اندر چل کر بیٹھو۔'' میں نے دیکھا کہ وہ صاحب اسی مکان میں داخل ہوئے ہیں جو میری منزل مقصود تھا۔ میں نے سائیکل دیوار سے لگا کر کھڑی کی اور اندر پہنچ کر انہی صاحب کے اشارے پر ایک اسٹول سنبھال کر بیٹھ رہا۔ پانی کا اک گلاس پی کر حواس قدرے ٹھکانے آئے تو میں نے بتایا کہ صبح سے مارا مارا پھر رہا ہوں اور مقصد یہ ہے کہ کسی طرح صفی صاحب سے ملاقات ہوجائے۔ وہ صاحب مسکرا کر بولے۔ ''اوہ! تو آپ صفی صاحب سے ملنا چاہتے ہیں؟' میں نے گردن اثبات میں ہلا دی تو وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گئے جہاں چارپائی پر ایک بزرگ لیٹے آرام کر رہے تھے۔ یہ رہے' صفی صاحب' ان سے مل لو۔ یہ کہہ کر وہ صاحب واپس اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں نے بزرگ صورت شخص کا ہاتھ تھام کر اپنے دلی جذبات کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ جب چند جملے بول چکا تو ان کی آنکھوں سے حیرت رفع ہوئی اور ہنس پڑے۔ ''برخوردار! شاید تم مجھے اسرار احمد سمجھ کر یہ سب کچھ کہہ رہے ہو جو نوجوان تمہیں یہاں چھوڑ کر گیا ہے' وہی ابن صفی ہے۔ میں صفی اللہ ہوں اور وہ میرا بیٹا ہے۔ اگرچہ یہ پہلی ملاقات تھی لیکن اس ملاقات میں مجھے اتنی محبت ملی کہ میں ابن صفی کا ہر ناول پڑھنے کے بعد اظہار خیال کے لیے ان کے پاس دوڑا چلا جاتا۔ رفتہ رفتہ یہ تعلق بڑھتا رہا حتیٰ کہ ۱۹۷۰ میں ان کی مطبوعات کی تیاری یعنی کتاب' چھپائی' جلد سازی' اور تقسیم و ترسیل تک میرے کندھوں پر آ گئی۔ میں نے یہ تمام ذمے داریاں یوں قبول کر لیں کہ ابن صفی صاحب کو لکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت مل سکے۔ کبھی کبھی وہ میری محنت کو سراہتے ہوئے میری اس بلا معاوضہ مشقت پر جھلا جاتے تو میں قسمیں کھا کھا کر انہیں یقین دلاتا کہ یہ سب کچھ میں صرف اپنے شوق کی تکمیل کے لیے کرتا ہوں۔ آخر لوگ مارے شوق کے کبوتر اڑاتے ہیں' جوا کھیلتے ہیں اور نہ جانے کیا کیا کرتے ہیں...... کیا آپ میرے اس شوق کی راہ میں اپنے بلا وجہ کے ایک احساس کی دیوار حائل کر دینا چاہتے ہیں؟ یہ سن کر وہ مسکرا دیتے اور خاموش ہوجاتے...... اور یہ خاموشی ۱۹۷۶ کی ایک شام اس جملے سے ٹوٹی ''مشتاق میاں! اگر تم اپنا ایک ڈائجسٹ نکال لو تو کیسا رہے؟'' میں چند لمحے سوچتا رہا پھر کہا۔ ''اگر آپ عملاً شامل ہوجائیں تو خوب رہے گا۔'' اب سوچ میں ڈوبنے کی ان کی باری تھی۔ میں نے لوہا قدرے گرم دیکھا تو ایک چوٹ اور لگائی اور پرچے کا نام ہوگا ''ابن صفی میگزین'' کچھ دیر میری طرف ناگواری سے دیکھتے رہے میں جانتا تھا کہ نام و نمود کی انہیں کبھی خواہش

نہیں رہی' اس لیے میں نے چند انگریزی ماہناموں کے نام لے کر انہیں قائل کرنا چاہا تو بالآخر میری ضد کے سامنے بے بس ہو گئے اور مجھے "ابن صفی میگزین" نکالنے کی اجازت دے دی۔ الحمدللہ یہ تجربہ بے حد کامیاب رہا تب یار لوگوں کو خاصی تکلیف ہوئی اور میری راہ میں روڑے اٹکائے گئے جس کی وجہ سے ابن صفی میگزین کو نئے افق کے تحت لانا پڑا لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ پرچہ اشاعت کے اعتبار سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ "بیٹا تمام اچھائی اور برائی اللہ کے ہاتھ میں ہے اس لیے جب کوئی کڑا وقت پڑے تو اسے رضائے الٰہی سمجھ کر قبول کر لیا کرو کبھی خسارے میں نہ رہو گے" یہ تھے ابن صفی کے الفاظ جو میری کامیابیوں کی بنیاد ہیں۔ دوستو! آج میں بہت اداس اور غمگین ہوں دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ میرے دکھ میں کمی کر دے اور محترم ابن صفی کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین۔

اسرار احمد فردوس نشین کا ایک خط

مشتاق احمد قریشی

پیارے شاگرد لائق و نالائق مشتاق:

''اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

جیتے رہو اپنی دنیا میں جب تک رہو خوش و تندرست رہو۔

اکیسویں صدی کے پانچ پر تین یعنی چھٹے سال کے تین مہینے بھی گزر گئے' میں انتظار ہی کرتا رہ گیا کہ تم ملو گے لیکن تم نہ ملے۔ ناچار مجھے یاددہانی کے لیے خود ہی کہنا پڑا...... گرچہ یہ میرے کہنے کی بات نہیں۔

تمہیں خود سے تو یاد نہیں ہے' میں یاد دلا دوں کہ یکم دسمبر ۱۹۵۵ء کو ماہنامہ ''نکہت' الہ آباد نے پہلی بار ''عمران کے کارنامے'' کے عنوان سے احمق اعظم عمران کی پہلی کہانی ''بھیانک آدمی'' کے نام سے پیش کی تھی' یہ دراصل جاسوسی دنیا کا انچاسواں شمارہ تھا۔ اسے قارئین کی بڑی تعداد نے پسند کیا تو پھر اس سلسلے کو کرنل فریدی کے ساتھ ساتھ چلانا پڑ گیا۔ عمران کے کردار نے قارئین کو کچھ اس طرح اپنی گرفت میں لیا کہ باقاعدہ ''عمران سیریز'' کی داغ بیل پڑ گئی۔

اس کی مقبولیت دیکھتے ہوئے پہلے تو یار لوگوں نے اس کردار پر ہاتھ صاف کیا' کوئی پیش نہ گئی تو انہوں نے اپنا رشتہ میرے جدِ امجد سے جوڑ لیا کوئی ابن صفی بن گیا تو کوئی نائب صفی غرض اس صفیوں کی قطار میں سے مجھے تلاشنا مشکل ہو گیا۔ بہرکیف یہ تمام صفیان ایک ایک کر کے دم توڑتے چلے گئے۔ تاہم بھانت بھانت کے لکھاریوں کی اس کوشش سے یہ ہوا کہ احمق اعظم کا کردار نئی نسل کو منتقل ہوتا رہا اور اب حال یہ ہے کہ اکیسویں صدی کے کئی قاری ایسے ہیں جو ''عمران سیریز'' پڑھتے ہیں لیکن اصل ابن صفی کو ہنوز نہیں جانتے۔ میں خوش ہوں کہ میرا مشن کسی بھی بہانے سے جاری ہے اور اس پرآشوب دور میں عمران کے تئیں تھکے ہارے لوگوں کے لبوں پر مسکان ابھرتی ہے۔ تو اس صدقہ جاریہ سے مجھے بھی ثواب پہنچتا ہے اور اس (عمران سیریز) کے عوض کسی گھر میں چولہا گرم ہوتا ہے یا کسی کی جیب' ہر صورت ہر لمحہ میری نیکیوں میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

یہ باتیں تو تمہیں معلوم ہی ہیں۔ میں نے جو بات کہنے کے لیے تمہیں یہ خط لکھنے کی نیت کی ہے وہ یہ ہے کہ اب تک بے شمار مصنفوں نے (تمہارے سمیت) عمران سیریز سے روٹیاں سیدھی کی ہیں لیکن کسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ عمران سیریز کی گولڈن جوبلی تقریب کے نام سے اس سیریز کے خالق کو یاد ہی کر لیں' مجھے یہ کہتے ہوئے خود سے شرم محسوس ہوتی ہے کہ اگر میں مغرب کے کسی ایسے ملک میں ہوتا جو

کتے بلیوں کا دن مناتے ہیں اور ہر اہم و غیر اہم شخصیات کا سال مناتے ہیں تو رواں سال کو "ابن انکل" کا سال قرار دے کر سیمینار' مباحثے اور نہ قابل تصور تقریبات منعقد کرتے لیکن خیر کوئی بات نہیں' میں بھی ڈاکٹر عبدالقدیر کی عزت افزائی دیکھ کر صبر کر رہا ہوں' اور اللہ رب کریم کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے اس دور سے پہلے ہی مجھے اپنے ہاں بلا لیا۔

تمہارے ذمے ایک آدھ کام ڈال رہا ہوں جو تمہارے لیے ممکن ہیں۔ پہلا کام تو یہ ہے کہ ایک صاحب ہیں جو آج کل پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ انہیں تلاش کر کے ان کے خیالات اپنے قارئین تک پہنچاؤ۔ یہ صاحب برطانیہ سے آئے ہیں' اپنے خاندان سمیت وہیں مقیم ہیں انہوں نے میری کئی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کر رکھا ہے اور اپنے انگریزی کے پڑھ ورددہ بچوں اور انگریز دوستوں سے پڑھواتے ہیں۔ تمہارے لیے ضروری تاکید ہے کہ اگر وہ صاحب نہ ملیں تو "لاشوں کا بازار" فوراً انگریزی میں ترجمہ کروا کر بین الاقوامی سطح پر پھیلا دو اور ہر ماہ میرا ایک ناول انگریزی میں "نئے افق" کے آخری صفحات پر دے دیا کرو تا کہ "قدردانوں" تک پہنچ سکے۔

دوسرے یہ کہ "ضیا محی الدین شو" میں میرا انٹرویو ٹیلی کاسٹ ہوا تھا۔ وہ انٹرویو نیو جنریشن تک پہنچواؤ۔ تیسرے یہ کہ "دھماکہ" بھی ٹی وی پر ٹیلی کاسٹ کروا دو۔

اور ہاں میں تم سے قطعی امید نہیں رکھتا کہ تم رواں سال کو "سال ابن صفی" قرار دلوا کر مذاکرے و مباحثے ترتیب دو کیونکہ تمہارا اپنا حساب کمزور ہے تم نے خود اکیسویں صدی ایک سال تاخیر سے شروع کی تھی۔ اور ملینیم فول ' افراد کی فہرست میں اپنا نام لکھوا کر میرا نام ڈبو دیا۔

میں بتاؤں کہ یکم دسمبر 1955 سے لے کر 30 نومبر 2005 کو عمران سیریز کے پورے پچاس سال ہو جائیں گے۔

یکم دسمبر 2005 کو عمران سیریز کا اکیاون واں سال شروع ہو جائے گا۔ اگر یہ حساب سمجھ نہ آئے تو کسی مڈل پاس پاکستانی مصنف کی کتاب خرید کر پڑھ لینا! سمجھ آ جائے گی۔ خدا کے لیے اکیسویں صدی کے آغاز کی طرح عمران سیریز کی گولڈن جوبلی کو بھی ایک سال تاخیر سے نہ منانا (اگر منانہ ہی ہوا تو......!)

خیر اندیش

تمہارا استاد: اسرار احمد فردوس نشین

ابن صفی کے ناول، انور۔ رشیدہ سیریز کا خصوصی مطالعہ

عمران عاکف خان دہلی، بھارت

ایم فل کے مقالے سے اقتباس

مقبول عام ادب کے سرتاج اور جاسوسی ناولوں کے عظیم مصنف ابن صفی کی ناول نگاری کا جہان اور کینوس بہت وسیع دحقائق پر مبنی ہے۔ انھوں نے قومی، بین الاقوامی، سیاسی، سماجی، معاشرتی، خاندانی، سائنسی، وراثتی، تعلیمی غرض زندگی کے ہر شعبے سے متعلق حقیقی موضوعات پر جاسوسی ناول لکھے۔

1952 سے ابن صفی نے جاسوسی ناول نگاری اور اپنی مشہور ومعروف سیریز 'فریدی۔ حمید سیریز' کا آغاز کیا۔ اس سے قبل وہ طنزیہ ومزاحیہ مضامین تحریر کرنے کے علاوہ شاعری بھی کرتے تھے، پھر شاعری ترک کی اور اردو ادب میں 'جاسوسی ادب' نامی صنف کا آغاز کیا اور تقریباً 28/ برس تک وہ اس میدان کے شہہ سوار، اس ریاست کے شہنشاہ اور اس جہان کے مالک ومختار بنے رہے، نیز فریدی۔ حمید سیریز کے علاوہ، عمران سیریز اور انور، رشیدہ سیریز پر مشتمل تقریباً 250/ ناول تحریر کیے۔

فریدی۔ حمید سیریز اور عمران سیریز، ابن صفی کی شاہ کار سیریزیں ہیں، ان کے علاوہ انور، رشیدہ سیریز بھی اپنی نوعیت کی ایک منفرد سیریز ہے۔ انور، رشیدہ کی جوڑی، گو فریدی۔ حمید کی طرح سرکاری جاسوس نہیں ہے، بلکہ ایک ایسی جوڑی کا نام ہے جو صحافت سے وابستہ ہے، مگر قومی درد اور احساس، جرائم سے نفرت اور حق وانصاف کی طلب، جرائم پر قانون کی بالادستی کا جذبہ اسی طرح قانون کے خدمت گاروں کی مدد کا شوق ان کے اندر اس قدر ہے کہ وہ محکمۂ اعلیٰ جنس کے لیے کام کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنی ہمہ وقتی وجز وقتی خدمات محکمہ سراغرسانی کے سپرد کر دیتے ہیں۔ ہوتے ہوتے ان کا تعلق محکمۂ سراغ رسانی کے مایاناز انسپکٹر وبعدۂ کرنل، احمد کمال فریدی سے ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کرنل فریدی اس جوڑی کو متعدد کیسوں میں لے کر آتا ہے اور اس کی حوصلہ افزائی وسرپرستی کے ساتھ ساتھ اسے محکمے کا عظیم سرمایہ بنا دیتا ہے۔ ایسے متعدد ناول ہیں جن میں ابن صفی نے کرنل فریدی اور کیپٹن حمید کے ساتھ انور، رشیدہ کے کارناموں کا تذکرہ کیا ہے۔ اسی ساتھ ساتھ 06/ ناول ایسے ہیں جو اسی جوڑی کے کارناموں پر مشتمل ہیں۔ ان میں کامیابی اور فریدی وعمران کے طرز پر کام کرنے کی وجہ سے ایک مستقل سیریز کا عنوان دیا گیا ہے۔

یہاں ایک بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب فریدی کے پاس بڑی تعداد میں افراد موجود تھے۔ وہ خود

تھا، حمید تھا اور پراسرار بلیک فورس کے بے شمار ممبران بھی، پھر انور اور رشیدہ کی مدد کی، اسے کیا ضرورت پڑی؟

اس سوال کا جواب ماہرین ابن صفی نے اس طرح دینے کی کوشش کی ہے:

چوں کہ انور۔رشیدہ کی جوڑی بنیادی طور پر صحافی ہے اور شہر کے مشہور اخبار 'روز نامہ اسٹار' کے شعبۂ کرائم سے وابستہ بھی۔اس لیے کرنل فریدی کو جرم اور مجرمین کے خلاف اخباری اور صحافتی پبلسٹی کی ضرورت بھی ہوتی تھی۔واردات کی رپورٹنگ اور نامہ نگاری کی ضرورت ہوتی تھی۔حالات اور سچویشن کے مطابق خبروں کی اشاعت کی غرض بھی ہوتی تھی۔اس وقت یہی جوڑی ان کارناموں کو انجام دیتی تھی اور فریدی کی منشا کے مطابق تمام اشاعتی امور انجام پا جاتے تھے۔دوسری بات یہ کہ کبھی کبھار ایسا ہوتا کہ کیس کی نوعیت ان خطوط سے ہٹ جاتی جن پر فریدی چلتا تھا، اس وقت اسے ایسے افراد کی ضرورت ہوتی جو سویلین انداز اور ڈریس میں اس کے لیے کام کریں۔عوام کے درمیان رہ کر غیر سماجی عناصر کا پتا لگائیں اور ان کا خاتمہ کریں۔چنانچہ اس طرح سے یہ جوڑی قانون اور قانون والوں کی مشکلیں آسان کرتی اور بدی پر نیکی کی اور جرم پر قانون کی بالا دستی قائم کرنے میں ہارڈ اسٹون کرنل فریدی کی بھی معاونت کرتی۔

فریدی۔حمید کے ساتھ اس جوڑی کے کارناموں کے علاوہ ابن صفی نے انفرادی طور پر بھی اس کے کارناموں کا تذکرہ کیا ہے چنانچہ '**ہیرے کی کان، تجوری کا گیت، آتشی پرندہ، ساڑھے پانچ بجے، پیش گوئی کا شکار، خونی پتھر**' نامی چھے ناول ایسے ہیں جن میں ابن صفی نے انور، رشیدہ ہی کے کارناموں کا تذکرہ کیا ہے اور اس طرح انھیں، زندہ جاوید بنا دیا۔اب قصہ یہ ہے کہ مقبول عام ادب اور ابن صفی کے ناولوں کا تذکرہ 'انور۔رشیدہ' سیریز کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا۔یہ ایک ایسی انوکھی جوڑی ہے جس کے کارنامے حالاں کہ بہت کم ہیں مگر پڑھنے والے اسے آج تک نہیں بھولے۔ان کی شجاعت، ہمت وحوصلے اور جواں مردی کی کہانیاں اب تک یاد ہیں

واضح رہے کہ مذکورہ بالا چھے ناول وہ ہیں جن میں انور اور رشیدہ اکیلے اپنے طور پر کیس ہینڈل کرتے ہیں اور مجرم یا مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے میں قانون کی مدد کرتے ہیں۔کیس کے حصول کی نوعیت بعینہ وہی ہے جو فریدی۔حمید یا عمران کو درپیش ہوتی تھی۔کبھی کسی کا فون آ گیا اور کسی فلیٹ یا پبلک مقام

میں لاش کی موجودگی کی اطلاع مل گئی۔ کبھی ان کے فلیٹ کے سامنے جان بوجھ کر کوئی حادثہ ہو گیا یا کرا دیا گیا۔ کبھی کسی ہوٹل میں ان کی موجودگی میں صورت حال بگڑ گئی۔ کبھی کوئی انصاف کی دہائی دیتا ہوا ان کے گھر پر آ دھمکتا......اور یہ جیالے مجرموں کی سرکوبی کے لیے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نکل پڑتے۔

اس سے پہلے کہ 'انور۔ رشیدہ سیریز' کا علاحدہ علاحدہ خصوصی مطالعہ پیش کیا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جوڑی کا پس منظر، اس کا باہمی تعلق و مزاج، فریدی اور حمید کا اس سے رویہ اور 'اسٹار' سے اس کے روابط کے متعلق حقائق کا علم ہو جائے۔ نیز یہ بھی کہ محکمہ سراغرسانی میں ان کی ضرورت و اہمیت کیوں اور کیا تھی۔

انور کے متعلق ابن صفی نے ایک جگہ اس طرح لکھا ہے:

(انور کا پورا نام 'انور سعید' تھا)'......وہ ایک بے پروا اور اکھڑ نوجوان تھا۔ اس نے اپنی زندگی ایک وکیل کی حیثیت سے شروع کی تھی لیکن کچھ دنوں بعد سب کچھ چھوڑ کر وہ اس راستے پر آ نکلا تھا۔ اسے دراصل کارناموں سے پیار تھا۔ پچھلی زندگی قطعی ناخوشگوار گزری تھی، اس لیے وہ ماضی کے دھندلکوں میں جھانکنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ اب تو وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ اس کے ماں باپ کون تھے۔ تھے بھی یا نہیں۔ وہ دنیا میں بالکل اکیلا تھا......وہ ایک اخبار میں جرائم کا نامہ نگار تھا اور اسی اخبار میں قسط وار جاسوسی ناولیں لکھا کرتا تھا۔ صحیح معنوں میں اخبار کا سب کچھ وہی تھا۔ اگر وہ ادارے سے الگ ہو جاتا تو دوسرے دن ہی اخبار کی تعدادِ اشاعت آدھی سے بھی کم رہ جاتی......وہ ایک کامیاب جاسوس بھی تھا۔'

ایک اور جگہ ناول 'تجوری کا گیت' میں ابن صفی نے انور کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

'انور کے کردار میں عجیب و غریب بات یہ تھی کہ وہ کسی کو معاف کرنا تو جانتا ہی نہ تھا۔ اس کا فلسفۂ حیات انتقام تھا......وہ بہت زیادہ دور اندیشی کا قائل نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا کے بڑے سے بڑے حادثے کا مقابلہ صرف حاضر دماغی سے کیا جا سکتا ہے۔ منطقی دلائل اور دور اندیشی فضول چیزیں ہیں۔ دور اندیشی غلط راستے پر بھی لے جا سکتی ہے۔'

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق ریسرچ اسکالر محمد مقیم، انور کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں:

'فریدی کا تربیت یافتہ انور ایک نڈر اور بے باک نوجوان ہے۔ شہر کے سارے راشی اور چھچھورے آفیسروں کی دکھتی رگیں انور کے ہاتھ میں ہیں اور وہ ان سے اپنا حق / حصہ بھی وصول کرتا ہے۔ انور کی لغت میں 'معافی' لفظ ہے ہی نہیں اور اس کا فلسفۂ حیات 'انتقام' ہے۔ انتقام، جس پر زندگی کا انحصار

ہے۔انور کو دور اندیشی کا مرض نہیں وہ اس خلا کو حاضر دماغی سے پر کرتا ہے۔اس کے نزدیک منطقی دلائل اور دور اندیشی تو قطعی فضول چیزیں ہیں......فریدی،انور سے اچھی طرح واقف ہے اور اسے پسند بھی کرتا ہے۔انور کی ذہانت کا مداح بھی ہے اور فریدی کا خیال ہے کہ انور کو بہترین جاسوس بنانے کے لیے تھوڑی سی محنت کی ضرورت ہے۔البتہ حمید انور کو قطعی پسند نہیں کرتا۔

ناول ''بھیانک جزیرہ'' میں ابن صفی نے انور کے متعلق حیرت انگیز انکشاف کیے ہیں۔جب ڈان ونسٹنٹ کے آدمی رشیدہ کو لے جاتے ہیں اور انور اس کے فراق میں شہر میں دیوانہ وار پھرتا ہے،اس وقت اسے البرونو کی طرف سے سرکلر روڈ پر واقع 'آشیانہ بلڈنگ' بلایا جاتا ہے۔وہاں اس کی ملاقات البرونو سے ہوتی ہے اور وہ اس سے لڑ بیٹھتا ہے۔اس وقت البرونو،اس سے کہتا ہے:

'میں تم دونوں کے متعلق سب کچھ جانتا ہوں۔'

'ہونہہ' انور طنزیہ انداز میں مسکرایا۔'تم میرے متعلق کیا جانتے ہو؟'

'سنو گے!' البرونو نے مسکرا کر کہا۔'اچھا سنو!تم نواب وجاہت علی خاں کے لڑکے ہو۔' انور بے اختیار اچھل پڑا۔وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر البرونو کی طرف دیکھ رہا تھا۔

'تمہارے چچا شہامت علی خاں نے تمھیں اپنے بھائی کی ناجائز اولاد ثابت کرا کے ان کے ترکے سے محروم کر دیا۔حالانکہ مجھے اچھی طرح علم ہے کہ تمھاری ماں ان کی بیوی تھی۔'......'مجھے تم سے ہمدردی ہے۔میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمھاری زندگی کا یہ حادثہ تمھیں غلط راستوں پر لے گیا۔تمھاری نظر میں یہ عظیم کائنات اور اس میں متحرک زندگی محض ایک ڈھکوسلا اور بے معنی چیز بن کر رہ گئی۔مجھے تم سے ہمدردی ہے۔'

رشیدہ کا تعارف ابن صفی نے اس طرح کراتے ہیں:

'رشیدہ اسی (انور) کے دفتر میں ٹائپسٹ تھی۔وہ نہ جانے کیوں انور کے اس قدر قریب آ گئی تھی۔ان دونوں کے فلیٹ بھی برابر ہی برابر واقع تھے۔صرف درمیان میں ایک دیوار حائل تھی۔رشیدہ بھی اسی کی طرح دنیا میں تنہا تھی۔اس نے اپنے متعلق اسے کچھ بھی نہیں بتایا۔سچ تو یہ ہے کہ انور نے کبھی پوچھا ہی نہیں۔ان دونوں میں دو چیزیں مشترک تھیں۔پہلی یہ کہ دونوں اس وسیع دنیا میں تنہا تھے۔دوسری یہ کہ دونوں کارنامے پسند کرتے تھے۔دونوں دلیر تھے۔دونوں کو پرانے سماج سے نفرت تھی۔متوسط طبقے کی صاف ستھری لیکن گھناؤنی زندگی ناپسند تھی۔شاید یہی وجہ ہے کہ دونوں قریب ہو گئے تھے......وہ دونوں

اکثر آپس میں لڑ بھی جاتے تھے اور یہ لڑائی کچھ اتنی تلخ ہوتی کہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے کہ اب وہ ایک دوسرے سے زندگی بھر نہیں بولیں گے لیکن ان کا یہ عہد زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوتا اور پھر ایک دوسرے سے بولنے پر مجبور ہو جاتے نہ جانے کیوں؟ صرف ایک بات پر رشیدہ انور سے بہت زیادہ نالاں رہا کرتی تھی۔ وہ یہ کہ انور فضول خرچ تھا اور جب مفلس ہو جاتا تو کبھی گھڑی بیچی جاتی کبھی انگوٹھی اور کبھی ردی کاغذ۔ ادھار لینے کا حاتم تھا لیکن پیسہ ملتے ہی سب سے پہلے پچھلا قرض بے باق کرنے کی فکر کرتا تھا۔'

ابن صفی نے 'رشیدہ' کا تفصیلی تعارف اپنے شاہ کار ناول '**بھیانک جزیرہ**' میں کچھ تفصیل سے کرایا ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک غیر معروف جزیرے کی فرد تھی اور اس کا نام 'سینورا رمولی' یا 'سی نورا' تھا۔ فریدی کے شہر میں اسے پرورش کے لیے رکھا گیا تھا۔ دراصل وہ 'جزیرہ بیرن آئی لینڈ' کی ولی عہد تھی۔ اس جزیرے کے اصولوں اور روایتوں کے مطابق اس کے ولی عہد کی تربیت باہری دنیا میں کی جاتی تھی۔ بچپن میں ہی اس کے بازو اور سینے پر داغ لگا کر شاہی نشان ڈال دیا جاتا تھا، تا کہ اس کی شناخت با سانی ہو سکے۔ نیز اس کی موجودگی کا علم چند لوگوں کو ہی ہوتا تھا۔ اس کے بعد جب وہ جزیرے میں پہنچایا جاتا، تو فاگان یا فاگانیہ کا لقب اختیار کر کے عنانِ حکومت اپنے ہاتھوں میں لیتا تھا۔ ناول 'بھیانک جزیرہ' کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ یہ جزیرہ ترقی یافتہ اور جدید ترین ممالک کی طرح تمام آلات و دفاعی اسباب سے لیس تھا۔ اس کے پاس منظم فوج اور مستحکم نظام حکومت تھا۔ باہری دنیا سے خود کو چھپائے رکھنے کے لیے وہاں کی انتظامیہ نے معقول بندوبست کر رکھا تھا۔ جس کی ایک شکل یہ تھی کہ جزیرے کے باشندوں نے اپنی چھتوں پر درخت اُگا رکھے تھے۔ اسی طرح ان پر طیارہ شکن توپیں بھی نصب کر رکھی تھیں۔ اس طرح بڑے بڑے درختوں کے جھنڈ میں فضا میں اڑنے والوں کو پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ وہ کسی آباد، ترقی یافتہ اور جدید سہولیات سے آراستہ جزیرے سے پرواز کر رہے ہیں، اگر کوئی بدقسمت طیارہ نیچی پرواز کرتا ہوا گزرتا، تو اسے مار گرایا جاتا اور باہری دنیا کے لوگ اخباروں میں پڑھتے ،فلاں طیارہ، بحر اٹلانٹک اور بحر کریبین کے درمیان پرواز کرتا ہوا پر اسرار طور پر غائب ہو گیا۔ ایک مقام پر فریدی اہل جزیرہ کی اسی ادا پر اپنے ساتھی اور جزیرے کے باشندے ڈیگاریگا سے کہتا ہے:

'میں سمجھتا ہوں!......اس جزیرے پر پرواز کرنے والے غیر ملکی ہوائی جہازوں سے محفوظ رہنے کے لیے تم لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔'

انور، رشیدہ کرداروں کا تفصیلی تعارف اور مجموعی خصوصیات و امتیازیات کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے شعیب نظام لکھتے ہیں:

'انور اور رشیدہ کے کردار عام انسانوں سے بہت قریب ہیں۔ ان میں جرم اور اس کی نفسیات کے ساتھ ساتھ محبت کی بھی ایک ایسی کیفیت اپنی طرف متوجہ کرتی ہے کو عام محبتوں کی داستانوں سے بہت الگ ہے۔

انور وکالت چھوڑ کر ایک اخبار کا کرائم رپورٹر ہے۔ رشیدہ بھی اسی اخبار میں کام کرتی ہے۔ دونوں ایک ہی اپارٹمنٹ کے برابر کے فلیٹوں میں رہتے ہیں۔ انور کا ماضی کچھ اس طرح کا ہے جسے وہ یاد رکھنا نہیں چاہتا۔ اس محرومی کا اثر اس کی شخصیت پر بہت گہرا ہے۔ رشیدہ ایک دوست ہونے کے ناطے اسے اپنے تصور کے مطابق ان نفسیاتی گروہوں کو کھول کر اسے ایک بہترین انسان بنانا چاہتی ہے جس میں وہ کامیاب نہیں ہو پاتی، کیوں کہ انور اپنے حالات سے مطمئن ہے، یا یوں کہیے کہ اس نے ان سے سمجھوتا کر لیا ہے۔ رشیدہ بار بار انور کے قریب جانا چاہتی ہے مگر وہ اسے کسی نہ کسی بہانے ٹال دیتا ہے۔ اسے رشیدہ کی بہادری اور مردانہ پن پسند ہے۔ یا وہ کم سے کم یہی، ظاہر کرنا چاہتا ہے۔

رشیدہ کا کردار 'تجوری کا گیت' ناول سے بہت پر اسرار ہو جاتا ہے۔ کوئی راز اس کے ماضی سے جڑا ہے جسے وہ انور تک سے پوشیدہ رکھنا چاہتی ہے۔ (ناول) 'بھیانک جزیرہ' میں جا کر اس راز سے پردہ اٹھتا ہے کہ وہ ایک گم نام جزیرے کی شہزادی ہے جہاں وہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر سکتی ہے مگر شاید انور کی محبت کی کشش اسے اخبار کی معمولی نوکری کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس کردار میں بہادری کے ساتھ عورت پن پوری طرح موجود ہے۔ وہ انور کا اس کی سابقہ محبوبہ سے ملنا پسند نہیں کرتی۔ (ناول) 'ہیرے کی کان' میں زبیدہ کے پیچھے انور کا بے تحاشا بھاگنا بھی اسے برا لگتا ہے۔ یہ ایک عام لڑکی کی نفسیات ہے مگر وہ انور کے لیے سب کچھ کر سکتی ہے اور کرتی بھی ہے چاہے اس میں اس کی مرضی شامل نہ ہو۔ یہ سب اس کی بے غرض محبت کا ثبوت ہے۔ انور نے ایک ناکام عشق بھی کیا تھا جس کا علم رشیدہ کو ہے، وہ انور کے کردار کی کجی کے لیے بھی اسی عشق کو ذمے دار سمجھتی ہے۔'

مشہور زمانہ سائٹ وکی پیڈیا نے انور۔ رشیدہ کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

Anwar

Anwar fleetingly delivers an opening in "Maut ki

Aandhee" (The Hurricane of Death – #12). He is an intelligent crime reporter, ex-lawyer, who respects only Faridi in law enforcement agencies. During a discussion in the above book, Faridi tries to explain to Hameed why Anwar is so bitter about life. Due to his harsh past life, Anwar changed into an angry, ruthless, but brave individual. He has a philosophy on life and he calls it "Revenge". To him, revenge is the driving force behind life.

Like Faridi, Imran, and Hameed, Anwar has also been bitten by love. Sajida was once involved with him but decided to leave Anwar for a businessman. Since then, Anwar desolated himself from the opposite sex and had been living in solitary. Sajida and her husband show up in "Heeray ki Kaan" (The Diamond Mine – #13) – the first book entirely on Anwar and Rasheeda's escapade.

Anwars's character is another example of Ibn-e-Safi's creativity and innovation for crafting personalities. Anwar's character is developed such that the reader wants to love and hate him at the same time. He is a black mailer but only for evildoers. He insults Rasheeda on her idea of falling into love with her but loves her as a close friend. He can be an accomplice to

a criminal on rare occasions but can also shoot them for committing crimes against humanity. He is a good guy acting like a bad one.

After "Maut ki Aandhee", when Faridi and Hameed took a long vacation after solving the case of Vilman's Mechanical Windstorm, Ibn-e-Safi wrote four books based solely on Anwar and Rasheeda's adventures. These four novels include "Heeray ki Kaan" (The Diamond Mine – #13), "Tijori ka Geet" (The Song of the Safe – #14), "Aatishi Parinda" (The Flaming Bird – #15), and "Khooni Patthar" (The Killing Stone – 16). By the time of "Khooni Patthar", public demanded that Faridi and Hameed be brought back from their vacation. Ibn-e-Safi respected that demand and conjoined the talents of Anwar and Rasheeda with that of Faridi and Hameed in "Bhayanak Jazeera" (The Frightful Island – #17) that is actually a story on Rasheeda's background.

Anwar is a crime reporter in "The Daily Star". He belongs to a very respectable rich family but, due to some differences of opinion, he lives alone. Anwar is a genius, and works as a private investigator. He plays it smart and keeps himself away from the police. Inspector Asif, a crooked police officer, is always asking for his help. However, as Anwar knows a lot

about Asif's illegal tactics, he blackmails the inspector just to get free dinners or cover other expenses. In spite of his own intelligence, he respects Faridi and considers him as his Guru. Faridi obtains unofficial help from Anwar and Rasheeda in many cases.

Rasheeda

Rasheeda, lives in apartment next to Anwar's, and is his colleague and a close friend. Anwar is always in debt with Rasheeda because of his heavy spending, especially on cigarettes, books, and dining out. They are in a love-hate relationship. Rasheeda is a courageous young woman who can fight bravely against the criminals. Her character is portrayed in a very mysterious manner, until her actual identity is revealed in "Bhayanak Jazeera" (The Terrifying Island #17). Readers discover that she is the crown princess of a secret place called "Barren Island", raised outside her state because of the risk to her life from opponents. However, for the sake of Anwar, she does not accept the crown. Withdrawing herself in favour of another girl, she returns

انور۔رشیدہ کی آمد اور ابن صفی کے انھیں کردار بنانے کے سبب پر اظہار خیال کرتے ہوئے ابن صفی انفو نامی سائٹ کا بیان ہے:

Anwar and Rasheeda

Anwar and Rasheeda's characters were introduced while Faridi and Hameed were away on vacation, touring Europe after solving the case of Vilman's Mechanical Windstorm in 'Mot Ki Aandhi'. Ibne Safi wrote five consecutive novels on Anwar and Rasheeda - Heeray Ki Kaan, Tijoari Ka Geet, Aatishee Paranda, Khooni Patthar, and Bhayanak Jazeera. In the fifth novel, Faridi and Hameed return back from their vacation and work together with Anwar and Rasheeda.

Anwar is a crime reporter in the daily The Star. He belongs to a very respectable rich family but, due to some differences of opinion, he lives alone. Anwar is a genius, and works as a private investigator. He plays it smart and keeps himself away from the police. Inspector Asif is always asking for his help; however, as Anwar knows a lot about Asif 's illegal tactics, he blackmails the Inspector just to get free dinners or cover other expenses. In spite of his own intelligence, he respects Faridi and considers him as his Guru. Faridi obtains unofficial help from Anwar and Rasheeda in many cases.

Rasheeda, lives in apartment next to Anwar's, and is his colleague and only friend. Anwar is always in debt with Rasheeda because of his heavy spending especially on cigarettes, books, and dining out. Theirs is a love hate relationship. Rasheeda is a courageous young woman who can

fight bravely against the criminals. Her character is portrayed in a very mysterious manner, until her actual identity is revealed in 'Bhayanak Jazeera'. Readers discover that she is the crown princess of a secret place called 'ýýBaron Island,þþ raised outside her state because of the risk to her life from opponents. However, for the sake of Anwar, she does not accept the crown. Withdrawing herself in favour of another girl, she returns back.

OOO

انور۔رشیدہ سیریز کا پہلا ناول -------- ہیرے کی کان

ہیرے کی کان 'انور۔رشیدہ سریز کا پہلا ناول ہے جس کی تخلیق ابن صفی نے ہندوستان کے دوران قیام، فروری 1953 میں کی۔ یہ ناول ابتدا سے لے کر انتہا تک انور۔رشیدہ کے کارناموں پر مشتمل ہے مگر مجرم کو قانون کی گرفت میں لینے کے لیے انسپکٹر آصف، ہیرے کی کان میں آدھمکتا ہے۔

'ہیرے کی کان' کہانی ابن صفی کے مفروضہ شہر تارجام کے مرکز سے ساٹھ میل کی دوری پر صنعتی علاقے میں واقع چند سازشی ذہنوں کی اپج 'ہیرے کی کان' سے ہوتی ہے۔ 'ہیرے کی کان' ایک خاص مقصد کے تحت 'دریافت' کی جاتی ہے اور اسکیم کے مطابق اس میں ہیروں کے چند ذرات چھپا کر مخصوص لوگوں کو اس میں سرمایہ کاری کی دعوت دی جاتی ہے، جسے ہاتھوں ہاتھ قبول کر کے لاکھوں کا سرمایہ لگا دیا جاتا ہے۔ ابتدا میں سرمایہ کاروں کو کچھ منافع بھی ہوتا ہے جس سے ماسٹر مائنڈ کی ذہنیت اور نیت پر کسی کو شبہ نہیں ہوتا مگر کچھ مدت گزر جانے کے بعد ماسٹر مائنڈ، تمام حصے داروں کے پیسے کھا کر اور یادداشت کھو بیٹھنے کا ڈھونگ رچا کر شہر سے ہی غائب ہو جاتا ہے۔ کہانی آگے بڑھتی ہے اور پھر سرمایہ کاروں کو اپنے لُٹنے پٹنے کا احساس ہوتا ہے اور وہ ماسٹر مائنڈ کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ یہاں سے جرم، حادثات، خون، سازش اور جعل سازیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ جس کی انتہا مجرم کی گرفتاری اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیلنے پر ہوتی ہے۔

شہر تارجام کے مرکز سے دور دراز صنعتی علاقے میں شام کے ساڑھے تین بجے دو فائر ہوتے ہیں

.....جنھیں سن کر آس پاس کے لوگ بدحواس ہو جاتے ہیں.....پھر کچھ دیر گزر جانے کے بعد جب ان کے حواس بجا ہوتے ہیں تو جائے حادثہ پر پہنچتے ہیں جہاں خاک و خون میں تڑپنے کے بعد گہری نیند سو جانے والی ایک لاش ملتی ہے۔ لاش کا چہرے مسخ ہو گیا ہے، سوائے معمولی سے خط خال کے جن سے لاش کی شناخت ممکن ہو.....لاش.....قتل.....واردات.....حادثے اور پولیس کا تعلق ازل سے ہی ہے۔ چنانچہ یہاں بھی 'تارجام کوتوالی' کی پولیس آئی اور لاش کو سرکاری ضابطوں میں لے کر ضروری کارروائیاں شروع کر دیں۔

پہلی نظر میں وہ حادثہ خودکشی نظر آیا۔ اس لیے کہ رائفل مقتول کے ہاتھ میں ہی تھی جس کا رخ اس کے چہرے کی طرف تھا۔ مگر مزید، گہری اور مختلف زاویوں سے کی جانے والی تفتیش کے بعد وہ حادثہ 'قتل' ثابت ہوتا ہے۔ یہاں سے کہانی الجھتی ہی چلی جاتی ہے۔

قاتل کون ہے اور کیوں یہ واردات انجام دی گئی.....مقتول کے ہاتھ میں رائفل کہاں سے آئی اور کیوں.....یہ بندوق کس کی ہے اور اس نے یہ غیر قانونی کام کیوں کیا کہ، بندوق دیدی؟ پولیس ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے لگتی ہے کہ ایک شخص پر شبہ ہوتا ہے، جو کہتا ہے کہ میں مقتول کا دوست ہوں.....رائفل میں نے ہی دی مگر مجھے اس کی نیت کا علم نہیں تھا.....ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا، یا بات بتائی کہ رواروی میں مجھے احساس بھی نہیں تھا کہ رائفل لوڈڈ ہے یا.....اور پولیس کو اسی بات نے اس پر شک کرنے پر مجبور کر دیا۔

لاش کی شناخت، وجہ قتل اور مقتول کے متعلق ابتدائی معلومات حاصل ہو جانے کے بعد' تارجام کوتوالی' پولیس نے باڈی ٹرک میں سوار کر دی...اور مشتبہ وبندوق دینے کے جرم میں زیر حراست شخص کو بھی ٹرک پر سوار کرنے لگی.....ابھی اس نے ونڈ وگرل پر پیر ہی رکھا تھا کہ گھپ اندھیرے میں سامنے سے ہونے والے فائر نے اسے فنا کے گھاٹ اتار دیا..... پولیس کی موجودگی، مستعدی اور ہوشیاری کے باوجود اتنا بڑا حادثہ ہو گیا.....جس کا فوری ردعمل یہ ہوا کہ پولیس تمام کام چھوڑ فائرنگ کی سمت دوڑ گئی.....اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر قاتل ایسا غائب ہوا کہ پولیس کی گھنٹوں تلاش کے باوجود بھی نہ مل سکا..... پولیس ہاتھ ملتی رہ گئی اور لاش کا خون زمین پر بہتا رہا۔

پہلے ایک لاش تھی اور اب دو لاشیں۔ پولیس کے ہاتھ سے پہلے قتل کا ایک ثبوت ختم ہو گیا، دوسرا قتل کس نے کیا، الجھاوا لازمی تھا.....اب کیا ہو سکتا تھا..... پولیس کسی ہاری ہوئی فوج کی مانند دونوں

لاشوں کو لے کر 'تارجام کوتوالی' کی جانب روانہ ہوگئی۔ اس کے بعد کہانی جیسے برق رفتاری سے چل پڑتی ہے اور پے در پے واقعات اسے بہت جلد انجام تک پہنچانے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔

OOO

مکمل کہانی کا مطالعہ:

کہانی کا آغاز دل چسپ اور عجیب وغریب انداز میں ہوتا ہے۔ انور، اپنے فلیٹ کے اسٹڈی روم میں کرسی میں دھنسا کتاب پڑھتا رہتا ہے۔ ایک کتاب پڑھی، دوسری اٹھائی، پھر تیسری۔ مگر کتابیں ہیں کہ، انور کو ان میں کچھ ملتا ہی نہیں۔ چنانچہ وہ بےزار سا ہو کر ایک کتاب کو اچھال دیتا ہے جو دروازے میں کھڑی رشیدہ کے اوپر جا پڑتی ہے۔ رشیدہ کی چیخ انور کو اس کے وجود کا احساس دلاتی ہے۔ انور اسے دیکھ کر بے خیالی کے عالم میں بڑبڑانے لگتا ہے:

'میں کہتا ہوں آخر ایسی کتابیں چھاپنے سے فائدہ؟'

'اور میں کہتی ہوں آخر تمھاری زندگی سے فائدہ؟' رشیدہ منہ بنا کر بولی۔

بس یہیں سے انور۔ رشیدہ کی آپسی نوک جھونک۔ کہا سنی اور مقابلہ آرائی شروع ہو جاتی ہے۔ جو ان کی زندگی کا ایسا جز ہے جس کے بغیر گویا وہ جی ہی نہ سکیں۔

'رشیدہ کو انور کا کتابوں کا اِدھر اُدھر پھیلانا بالکل پسند نہیں آیا۔ وہ کتابوں کو سلیقے سے رکھنے لگتی ہے کہ اچانک انور کھانے اور پیسے نہ ہونے کی دہائی دیتا ہے، جس کے جواب میں رشیدہ بھی ہاتھ جھٹکا دیتی ہے۔ مگر انور اس پریشانی کا مقابلہ اخبار کی ردی بیچ کر کرنا چاہتا ہے۔ ذرا سی بحث کے بعد رشیدہ کہا بھی مان لیتی ہے اور اخبارات کا پلندہ اٹھا کر باہر نکل جاتی ہے۔

ابھی تھوڑی دیر بھی نہیں گزرنے پاتی ہے کہ رشیدہ انور کو کسی عورت کے ملنے کی اطلاع دیتی ہے۔ جس کے جواب میں انور اسے کمرے میں بھیجنے کو کہہ کر پھر کتابوں کی ورق گردانی میں مصروف ہو جاتا ہے۔ وہ عورت آتی ہے اس کا نام ساجدہ ہے۔ ساجدہ جو کسی زمانے میں انور کی منظورِ نظر تھی اور کسی حد تک اس کی موجودہ حالت کی ذمے دار بھی۔ وہ انور کو بےقرار اور تڑپتا ہوا چھوڑ کر شہر کے ایک مشہور سرمایہ کار ارشاد علی سے شادی کر لیتی ہے اور انور اس کی جدائی میں گھنٹیاں بجاتا رہ جاتا ہے۔

ساجدہ گھبرائی گھبرائی اور پریشان حال اپنی آمد کا مقصد اپنے شوہر کی یادداشت کھونے اور تین روز سے غائب ہونے کا واقعہ بیان کرتی ہے اور انور سے درخواست کرتی ہے کہ وہ انھیں تلاش کرے۔ اس

کام کے لیے وہ انور کو معاوضے کے طور پر پیشگی پانچ سو روپے دیتی ہے اور بقیہ کام ہونے کے بعد دینے کا وعدہ کرتی ہے۔ باتوں ہی باتوں میں انور اس سے پولیس سے مدد مانگنے کی بات کہتا ہے، تو ساجدہ اسے سمجھاتی ہے کہ اس طرح دیگر بزنس پارٹنرز کو گول مال اور بے ایمانی کرنے کا موقع مل جائے گا۔ انور اس منطق اور صحیح عذر کو سمجھ کر ارشاد علی کی تلاش کی حامی بھر لیتا ہے۔ اس کے لیے وہ سب سے پہلے اس کے بزنس کے ساجھی داروں کے نام اور پتے پوچھ کر ڈائری میں لکھنے لگتا ہے۔

ابن صفی کی تحریروں کے جواہر پارے

نہیں انہیں کچھ نہ کہو وہ ہمیشہ بہت پیارے اور سچے لوگ تھے مکمل کر نفرت کرتے تھے اور پاگلوں کی طرح ایک دوسرے کو چاہتے تھے اب تو کچھ بھی نہیں رہا نہ نفرت نہ محبت لوگ مصلحتاً ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہیں اور زندگی بھر اداکاری کرتے رہتے ہیں (بھیڑیے کی آواز)

ہر افواہ کے پیچھے کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہوتی ہے۔ (شاہی نقارہ)

ایک بار کوئی نظریہ قائم کر لینے کے بعد اس کا اس سے ہٹ جانا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ منہ میں پانی لے کر سیٹی بجانا۔

(شاہی نقارہ)

اکثر محبت کرنے والے محبوب کی موت نہیں برداشت کر سکتے۔ کہانیاں ہیں فرزند جب ایک ماں جوان بیٹے کی موت کے بعد بھی زندہ رہ سکتی ہے تو یہ سب قطعی بکواس ہے (خوفناک منصوبہ)

میں جانتا ہوں کہ حکومتوں سے سرزد ہونے والے جرائم جرائم نہیں حکمت عملی کہلاتے ہیں جرم تو صرف وہ ہے جو انفرادی حیثیت سے کیا جائے (جونک کی واپسی)

جو عبادت آدمی کو آدمی نہیں بنا سکتی میں اس عبادت کے بارے میں اپنی رائے محفوظ کرنے پر مجبور ہوں۔ (صحرائی دیوانہ حصہ دوم)

دنیا کا کوئی مجرم بھی سزا سے نہیں بچ سکتا قدرت خود ہی اسے اس کے مناسب انجام کی طرف دھکیلتی ہے اگر ایسا نہ ہو تو تم ایک رات بھی اپنی چھت کے نیچے آرام کی نیند نہ سو سکو زمین پر فتنوں کے علاوہ اور کچھ نہ اگے۔ (ہیرو کا فریب)

ایک پرندے کو سنہرے قفس میں بند کر کے دنیا کی نعمتیں اس کے لیے مہیا کر دو لیکن کیا وہ پرندہ تمہیں

دعائیں دے گا؟ (دشمنوں کا شہر)

کچھ لوگوں کو دوسروں کو دکھ پہنچا کر ہی لذت حاصل ہوتی ہے انسانی زندگی کی منزل حصول لذت ضرور ہے لیکن اسی کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ہم دوسروں کو حصول لذت سے محروم تو نہیں کر رہے ہیں۔ (شاہی نقارہ)

یہ آدمی کے چھچھورے پن کی کہانی ہے اس کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے دنیا کی بڑی طاقتیں جو اپنے اقتدار کے لیے رسہ کشی کر رہی ہیں اس سے بھی زیادہ کر سکتی ہیں ان کے بلند بانگ نعرے جو انسانیت کا بول بالا کرنے والے کہلاتے ہیں زہر آلود ہیں۔ (وبائی ہیجان)

تمہارے ذہن میں قناعت کا تصور بہت ہی گھٹیا قسم کا معلوم ہوتا ہے قناعت سے شاید تم یہ مراد لیتے ہو کہ آدمی تارک الدنیا ہو جائے ملے تو کھائے ورنہ فاقے کرے حالانکہ قناعت کا یہ مطلب نہیں ہے قناعت کا مطلب ہوس سے دامن بچانا ہے۔ (ہولناک ویرانے)

چالاک بن کر کیا کروں گی ضرورت ہی کیا ہے سیدھے سادے آدمیوں کی طرح زندہ رہو اور خوشیاں سمیٹتے رہو دوسروں کی چالاکی ہمیں اسی لیے دل گرفتہ کر دیتی ہے کہ ہماری چالاکی مات کھا گئی ہے۔ (خونریز تصادم)

احساس کمتری شخصیت کے لیے سم قاتل سے کم نہیں ہوتا (پیاسا سمندر)

نیک کاموں کے لیے اگر آدمی کو اپنا سطح سے گرنا پڑے تب بھی پروانہ ہونی چاہیے۔ (فرہاد۔۵۹)

آدمی خواہ کتنا ہی اونچا کیوں نہ ہو اگر معاشرہ کے لیے نقصان دہ ہے تو کسی حقیر چیونٹی ہی کی طرح ایک نہ ایک دن خاک میں مل جائے گا (زہریلا آدمی)

پیام پہنچانے والوں کو زیادہ تر اپنی پوجا کرانے کی فکر رہتی ہے اس لیے وہ صرف اختلافی مسائل پر ایک دوسرے کو للکارتے رہتے ہیں (کالی کہکشاں)

آدمی کی حقیقت اس کا جسم نہیں بلکہ دماغ ہے، گوشت اور ہڈیوں کا ڈھیر کوئی حیثیت نہیں رکھتا، آدمی کا دماغ ہی اسے سر بلند کرتا ہے دنیا اس کے قدموں پر جھکتی ہے اور جب یہ دماغ ناکارہ ہو جاتا ہے تو قدموں پر جھکنے والے اسی گوشت اور ہڈیوں کے ڈھیر کو پکڑ کر کسی پاگل خانے میں بند کر دیتے ہیں اور دو پیسے کے آدمی اس پر ڈنڈے برسایا کرتے ہیں (پانی کا دھواں)

میں عموماً بنجر زمینوں پر کاشت کرتا ہوں اور کچھ نہیں تو کانٹے دار پودے ہی اگا لیتا ہوں اور وہ کانٹے

میرے لیے خون کی بوندیں فراہم کر دیتے ہیں۔ (مہکتے محافظ)
آدمی سنجیدہ ہو کر کیا کرے جبکہ وہ جانتا ہے کہ ایک دن اسے اپنی سنجیدگی سمیت دفن ہو جانا پڑے گا۔"
(کالی تصویر)
اگر میں اس سڑک پر ناچنا شروع کر دوں تو مجھے دیوانہ کہو گے لیکن لاشوں پر ناچنے والے سورما کہلاتے ہیں انہیں اعزاز ملتے ہیں ان کی چھاتیاں تمغوں سے سجائی جاتی ہیں (خطرناک لاشیں)
یہی تو مصیبت ہے ہم سب ایک دوسرے کو برا کہہ رہے ہیں مگر توفیق نہیں ہوئی کہ کبھی اپنے گریبانوں میں جھانکنے کی کوشش کریں۔ (سہ رنگی موت)
خدا کے وجود کا منکر ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ تمہیں ہر کس و ناکس پر اپنے باپ ہونے کا شبہ ہوتا ہوگا۔ (پاگلوں کی انجمن)
ایک نیکی ہزار نیکیوں کو جنم دیتی ہے اور نیکی کے لیے دل پر صبر کرنا پڑتا ہے اسی دانے کی طرح خاک میں ملنا پڑتا ہے۔ (بلی چیختی ہے)
یہ ایٹم کا زمانہ ہے وہ زمانہ لد گیا جب شہرت لوگوں کے پیچھے دوڑتی تھی اب شہرت کے پیچھے دوڑنا پڑتا ہے۔ (ڈیڑھ متوالے)
اپنے وجود مستی کیا کم ہے کہ کسی نشہ کا سہارا لیا جائے (صحرائی دیوانہ حصہ دوم)
ذہین سے ذہین مرد بھی جنسیت کے معاملے میں معمولی آدمیوں سے مختلف نہیں ہوتا (پراسرار وصیت)
آدمی جب درندگی پر اتر آتا ہے تو جانوروں سے بدتر ہو جاتا ہے کیا تم نے کبھی کسی کتے کو دوسرے کتے کا گوشت کھاتے دیکھا ہے۔ (سانپوں کا مسیحا)
پندرہ دن ہوئے پاگل خانے سے بھاگا ہوں سیٹھ سے ملاقات نہ ہوگئی ہوتی تو سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیتا۔ (بابا سگ پرست)
"میں شراب نہیں پیتا۔" حمید نے کسی قدر ترشی سے کہا۔
وہ تھوڑی دیر تک اسے بغور دیکھتی رہی پھر پوچھا "کیوں نہیں پیتے۔"
"اس لیے کہ مسلمان ہوں۔"
"تو مذہبی آدمی ہو۔"
"یقیناً!" (رلانے والی)

ابن صفی......ایک لیجنڈ

سیف اللہ خالد

اب سے نصف صدی قبل ایک شخص کا نام، جو روزمرہ کی گفتگو کا حصہ تھا آج اس طرح اجنبی ہے کہ اس کا تفصیلی تعارف بھی اس کی شخصیت اردو ادب میں اس کے کارہائے نمایاں کی وضاحت نہیں کرتا تاہم وقت تبدیل ہو رہا ہے اور اس شخص جسے ابن صفی کہتے ہیں کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا جانے لگا ہے ہمسایہ ملک بھارت میں ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کے انگریزی تراجم شائع ہو رہے ہیں جبکہ اندرون ملک ان کی کتابوں کی اشاعت کا دوبارہ آغاز نئی تزئین وطبع اور ترتیب سے ہوا ہے۔

ابن صفی برصغیر پاک وہند میں اردو کے واحد جاسوسی ناول نگار تھے اپنی طرز میں منفرد ناول کی اس صنف میں ابن صفی نے اردو زبان کی ترویج واشاعت ہی کے لیے کام نہیں کیا بلکہ نوجوان نسل کے اخلاق وچلن کی بہترین اٹھان کے لیے بہترین تحریری مواد تخلیق کیا ابن صفی نے دو جاسوسی سلسلے شروع کیے تھے۔ جاسوسی دنیا اور عمران سیریز جاسوسی دنیا میں مرکزی کردار فریدی اور عمران سیریز میں علی عمران تھا یہ سلسلے پر اسرار دلچسپ اور پرکشش تھے اس لیے بہت جلد مقبولیت پا گئے ان کے کردار اخلاق وتہذیب کے اعلیٰ نمونے تھے جو پڑھنے والوں کو اپنی تقلید پر مائل کرتے تھے یوں لڑکوں اور نوجوانوں کے لیے ان میں اچھا سبق تھا اور بڑوں کے لیے زبان کا ذائقہ اور ذہنی تفریح تھا ابن صفی کے ناول ہر عمر میں مقبول تھے ان کا زمانہ رومانس کا زمانہ تھا تب اخلاقی وسماجی ضابطہ وحیات کی قدر تھی بزرگی کا ادب تھا علم کی عزت تھی اور ابن صفی کا قلم ان سب خوبیوں کو نہ صرف اجاگر کرتا تھا بلکہ ان کے پھیلاؤ میں پیش پیش تھا۔

ابن صفی اب زندہ نہیں ہیں لیکن ان کا ورثہ جاندار کتابوں کی صورت میں موجود ہے یہ کتابیں اب بھی اس دور میں بھی اپنا مقام رکھتی ہیں جبکہ چھپا ہوا لفظ اپنی وقعت کھو رہا ہے اور پڑھنے والوں کا شوق ذوق ٹیکسٹ میسج اور فیس بک تک محدود ہو چکا ہے۔

ابن صفی اپنے بارے میں کیا لکھتے ہیں ان کی تحریر قارئین کی نذر ہے۔

بقلم خود......ابن صفی

اپریل 1928ء کی کوئی تاریخ تھی اور جمعہ کا دن شام کے دھندلکوں میں تحلیل ہو رہا تھا جب میں نے پہلی بار اپنے رونے کی آواز سنی ویسے دوسروں سے سنا ہے اتنا نحیف تھا کہ رونے کے لیے منہ تو کھول سکتا تھا لیکن آواز نہیں نکال سکتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ دوسروں کو میری آواز اب بھی نہیں سنائی دیتی کب سے حلق پھاڑ رہا ہوں...... وہ حیرت سے میری طرف دیکھتے ہیں اور پھر بے تعلقی سے منہ پھیر لیتے ہیں...... خیر کبھی تو...... اوہو پتا نہیں کیوں اپنے یوم پیدائش کی بات نکلنے پر بے حد سنجیدہ ہو جاتا ہوں۔

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

جب بھی یہ مصرعہ ذہن میں گونجتا ہے ایک بھاری آواز اس پر طاری ہو جاتی ہے "میاں کس کھیت کی مولی ہو تم نہ ہوتے تب بھی اردو کو سری ادب کے اس دور سے ضرور گزرنا پڑتا۔ 1947ء کے فسادات کے بعد خواب دیکھنے والا کوئی مسلمان، ایک کرنل فریدی ضرور پیدا کرتا کرنل فریدی جو ساری دنیا میں صرف قانون کی حکمران کا خواہاں ہے۔"

میں اس کے جواب میں کہتا ہوں ''اونہہ...... فراری ذہنیت کا ایک نمونہ میں نے بھی پیش کیا ہے مجھے اس کا اعتراف ہے لیکن دنیا میں یہی ہوتا رہا ہے ہوائی قلعوں ہی نے اکثر ٹھوس حقائق کی طرف رہنمائی کی ہے۔''
قصبہ نارہ ضلع الہ آباد و یوپی میں ہوش سنبھالا ابتدائی تعلیم قصبے ہی کے اسکول میں ہوئی نصابی کتب کے علاوہ پہلی کتاب جو ہاتھ لگی وہ طلسم ہوشربا کی پہلی جلد تھی ہر چند کہ اس کی زبان آٹھ سال کے بچے کے بس کا روگ نہیں تھی پھر بھی کہانی تو پلے پڑ ہی گئی تھی پے در پے ساتوں جلدیں چاٹ ڈالیں پھر یاد نہیں کتنی بار ساتوں جلدیں دہرائی گئی تھیں۔
آٹھویں یا نویں درجے تک پہنچ کر شاعری شروع کی۔ حضرت جگر مرادآبادی حواس پر چھائے ہوئے تھے خرابات میں طبع آزمائی ہوئی اور اس زور و شور سے ہوئی کہ کبھی کبھی سوچنا پڑتا کہیں سچ مچ تو نہیں پینے لگا مثلاً
ہمیں تو ہے مئے گل رنگ و گل رخاں سے غرض۔ ہنائے کفر پڑی کس طرح خدا جانے بس اتنا یاد ہے
اسرار وقت مئے نوشی۔ کسی کی یاد بھی آئی تھی مجھ کو سمجھانے۔
1947ء میں یونیورسٹی پہنچا تو ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا ان کے لیکچرز نے ذہنی نشو و نما کے نئے باب کھولے فکر و نظر کی تہذیب کرنے کا سلیقہ پیدا ہوا لیکن بدقسمتی سے یہ مدت بہت قلیل تھی 1947ء کے فسادات شروع ہو چکے تھے یونیورسٹی جانا بند کرا دیا گیا پھر دوسرے سال دوبارہ داخلے کی ہمت اس لیے نہیں پڑی تھی کہ میرے ساتھی فورتھ ایئر میں پہنچ گئے تھے الہ آباد یونیورسٹی میں پرائیویٹ امیدواروں کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی یوپی میں صرف آگرہ یونیورسٹی ایسے طلبا کا واحد سہارا تھی لیکن شرط یہ تھی کہ امیدوار کو کسی ہائی اسکول میں معلمی کا دو سالہ تجربہ ہونا چاہیے میں نے سوچا چلو یہی سہی، دو سال تک لوگ ماسٹر صاحب ہی تو کہہ لیں گے یونیورسٹی میں داخلہ لے کر احساس کمتری کا شکار تو نہ ہونا پڑے گا لہٰذا بی اے آگرہ یونیورسٹی سے کیا تھا۔
اسی دوران میں ہم لوگوں نے الہ آباد سے ماہنامہ ''نکہت'' جاری کیا جس کے موسس عباس حسینی تھے شعبہ نثر کی ادارت ابن سعید نے سنبھالی اور حصہ نظم میرے حصے میں آیا میں نے اس کے ساتھ طنزیہ مضامین کا سلسلہ بھی شروع کیا یہ مضامین طغرل فرغان کے نام سے لکھے تھے۔
میں یہ سب کچھ کرتا رہا لیکن آٹھ سال کا وہ بچہ جس نے طلسم ہوشربا کی ساتویں جلدیں چاٹ لی تھیں، کسی طرح بھی میرا پیچھا چھوڑنے پر تیار نہیں تھا شعر کہنے بیٹھتا تو سامنے آ کھڑا ہوتا، نثر لکھتے وقت تو قلم ہی پر ہاتھ ڈال دیتا، اور پھر میں جھلا کر اس کے پیچھے دوڑ پڑتا، اس کا تعاقب کرتا ہوا طلسم ہوشربا کی فضاؤں سے گزرتا اور بالآخر وہ مجھے رائیڈر ہیگرڈ کی عیر فانی ہیا کے دربار میں پہنچا کر نظروں سے اوجھل ہو جاتا پھر مجھے ایسا محسوس ہونے لگتا جیسے میری ساری نثری تخلیقات اجاڑ ویرانوں کے علاوہ اور کچھ نہ ہوں، بے چینی بڑھ جاتی ہے اطمینان کی حد نہ رہتی پھر کیا کیا جائے اکثر سوچتا آخر سریت پسندی کے رجحان کی تسکین کیوں کر ہو؟
پھر ایک دن یہ ہوا کہ ایک ادبی نشست میں کسی بزرگ نے کہا اردو میں صرف جنسی افسانوں کی مارکیٹ ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں بکتا۔
میں نے کہا۔ یہ درست ہے لیکن ابھی تک کسی نے بھی جنسی لٹریچر کے سیلاب کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ کسی طرف سے آواز آئی ہینا ممکن ہے جب تک کوئی متبادل چیز مقابلے میں نہ لائی جائے یہ قطعی ناممکن ہے۔
متبادل چیز میں نے سوچا اور پھر وہی آٹھ سال کا بچہ سامنے آ کھڑا ہوا جس نے طلسم ہوشربا کی ساتوں

جلدیں چاٹ ڈالی تھیں اور یہ بھی دیکھا تھا کہ اسی سال کے بوڑھے بھی بچوں ہی کی طرح طلسم ہوشربا میں گم ہو جاتے ہیں۔

میں نے کہا "اچھی بات ہے میں دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ 51ء کے اواخر کی بات ہے جب افسانوی ادب (بشمول ناول) میں افسانویت کے علاوہ اور سب کچھ بکثرت پایا جاتا ہے اور ناول میں "ناولٹی" مقصود تھی۔

میں نے اسی "ناولٹی" پر زور دیتے ہوئے جاسوسی ناول لکھنے کا فیصلہ کیا۔

جنوری 52ء میں میرے ہی مشورے پر ادارہ نکہت نے ماہنامہ جاسوسی ناولوں کا سلسلہ شروع کیا سلسلے کا نام "جاسوسی دنیا" تجویز ہوا اب تک ایک سو اسی ناول لکھ چکا ہوں ان میں سے صرف آٹھ جزوی یا کلی طور پر انگریزی سے ماخوذ ہیں ورنہ سب طبع زاد ہیں۔

الٰہ باد میں صرف سات ناول لکھے تھے اس کے بعد اگست 52ء میں کراچی آ گیا تھا بقیہ ناول یہیں لکھے پھر 56ء میں کراچی سے عمران سیریز کے ناول شروع کیے تھے۔

اکثر احباب کہتے ہیں تم نے طغرل فرغان اور اسرار ناروی کو قتل کر کے اچھا نہیں کیا انہیں زندہ رکھا ہوتا تو آج "ادب العالیہ" میں تمہارا بھی کوئی مقام ہوتا۔

میں ان سے کہتا ہوں بھائی ادب العالیہ کی شمع جلائے پانچ آدمیوں کے حلقے میں بیٹھا نظر آتا یہی تو مقام ہوتا میرا اور کچھ۔

مجھ سے کوئی سلیم جعفری (ایک وسیع النظر صحافی اور باصلاحیت ٹی وی آرٹسٹ) یہ نہ کہتا کہ صفی صاحب اردو میری مادری زبان نہیں ہے لیکن آپ جو یہ بامحاورہ اردو مجھ سے سن رہے ہیں آپ ہی کی کتب کے مطالعے کی رہین منت ہے۔

سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد سے میرے پڑھنے والے مجھے ایسے ہی حوصلہ افزا خطوط بھی لکھتے رہتے ہیں، مجھے اس کے علاوہ اور کیا چاہیے اور پھر میں جو کچھ بھی پیش کر رہا ہوں اسے کسی قسم کے بھی ادب سے کمتر نہیں سمجھتا ہو سکتا ہے میری کتابیں الماریوں کی زینت نہ بنتی ہوں لیکن تکیوں کے نیچے ضرور ملیں گی ہر کتاب بار بار پڑھی جاتی ہے میں نے اپنے لیے ایسے میڈیم کا انتخاب کیا ہے کہ میرے افکار زیادہ سے زیادہ افراد تک پہنچ سکیں، ہر طبقے میں پڑھا جاؤں اور بحمد اللہ میں اس میں کامیاب ہوا ہوں، تھکے ہوئے ذہنوں کے لیے صحت مند تفریح مہیا کرتا ہوں کچھ نہ کچھ پڑھتے رہنے کی عادت ڈلوائی ہے بر صغیر میں ریڈنگ لائبریریوں کا رواج میرے بعد ہی ہوا ہے انہی لائبریریوں میں ادب العالیہ بھی کھپ جاتا ہے جاسوسی ناول پڑھنے والوں کو جب کوئی ناول نہیں ملتا تو ادب العالیہ بھی پڑھ لیتے ہیں لہٰذا ادب العالیہ پر ناز کرنے والوں کو مجھ پر خار نہ دکھانا چاہیے انہیں تو مجھ پر پیار آنا چاہیے ادب العالیہ کی رسائی عوام تک کرانے کا سہرا بھی میرے ہی سر ہے۔

بقلم خود اتنا کچھ لکھ دینے کے بعد سوچ رہا ہوں کہ اپنے بارے میں کچھ لکھنا بڑا جان جوکھم کا کام ہے کہاں تک اپنائیت کو دبایا جا سکتا ہے تھوڑی بہت لاف گزاف بھی ہو جاتی ہے اسی لیے میرا اپنا ہی خیال ہے کہ اپنے بارے میں گفتگو کرنے والے اول درجے کے بے وقوف ہوتے ہیں لیکن مجھ سے یہ بے وقوفی سرزد کرائی گئی میں خود اس کا ذمہ دار نہیں ہوں اللہ بڑا کرم کرنے والا ہے۔

ابن صفی کے
قلم کی مصوری